(منقول از تشحیذالاذہان)

از

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم

دیباچہ

مسیحیوں کی طرف سے ہمیشہ اعتراض ہؤا کرتا ہے کہ نجات کی حقیقت کو ہی غیر مذاہب کے لوگ نہیں سمجھتے تو پھر اس کے حصول کے ذرائع ان کو کیونکر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جو چیز کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔ وہ اس کے حاصل کرنے میں کامیاب کیونکر ہو سکتا ہے مثلاً ایک شخص نہیں جانتا کہ وکالت کا کوئی امتحان ہوتا ہے تو پھر وہ اس کے پاس کرنے کی تیاری کیونکر کر سکتا ہے۔ یا اگر کسی کو یہ بھی معلوم ہو کہ وکالت کا امتحان ہوتا ہے مگر وہ یہ نہ جانے کہ اس میں کیا کچھ پڑھایا جاتا ہے اور کون کون سی کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے تو ایسے شخص سے اس کے پاس کرنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ مرض کا علاج تب ہی ہوتا ہے کہ جب مرض کی تشخیص بھی ہو چکی ہو۔ اگر کوئی مرض کی حقیقت سے ہی ناواقف ہے تو پھر اس کا علاج کیا خاک کرے گا۔ پس اس اعتراض کے ماتحت وہ کل مذاہب کو ردّ کرتے اور ان کے پیرؤوں کی بیوقوفیوں پر ہنستے ہیں۔ مگر دعویٰ اور دلائل میں بڑا فرق ہے۔ ایک انسان دعویٰ تو بہت کر سکتا ہے مگر ثبوت ہر ایک دعویٰ کا مشکل سے لا سکتا ہے۔ مگر ثبوت کے بغیر تو دعووں کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر پادری صاحبان ہم پر ہنسیں تو ہم بھی بقول حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام یہی کہیں گے کہ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ۔ (ھود: ۳۹)

مگر چونکہ نجات کا مسئلہ ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں رسالہ تشحیذ الاذہان میں سلسلہ وار ایک مفصل مضمون لکھ کر اس پر کچھ روشنی ڈالوں اور ثابت کروں کہ جو نجات کی حقیقت اسلام نے بتائی ہے کوئی مذہب اس تک نہیں پہنچ سکا اور یہ کہ کل مذاہب اس معاملہ میں بہت حد تک غلطی پر ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيْمِ۔

ارادہ تو میرا اس مضمون پر کچھ لکھنے کا مدت سے تھا- مگر ایک عرصہ سے طبیعت کچھ علیل رہی ہے- چنانچہ اول تو قریباً ایک ماہ تک کسی قدر بخار ہوتا رہا اور سخت سر درد کا دورہ رہا- اب کوئی ہفتہ بھر سے کھانسی ہو رہی ہے- مگر اس خیال سے کہ آخر یہ کام کرنا تو ہے ہی خدا تعالیٰ کے بھروسہ پر شروع کرتا ہوں- اگر منشائے الٰہی ہو گا تو پورا ہو رہے گا- اس علالت طبع کی وجہ سے ہی قدامت مادہ کا مضمون بھی شروع نہ کر سکا- حالانکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ مارچ تک شروع کر دیا جائے گا شاید ایک دو ماہ اس میں اور توقف پڑ جائے- وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

چونکہ یہ مضمون سلسلہ وار نکلے گا (انشاء اللہ) اس لئے جملہ خریداران رسالہ سے التجا ہے کہ وہ اس کو سنبھال کر رکھیں تو آخر میں انشاء اللہ ایک چھوٹی سی کتاب بن جائے گی- اور ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی سعید روح اس سے فائدہ اٹھائے- وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

راقم

خاکسار

مرزا محمود احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

نجات کافلسفہ

تمہید میں اس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اس قدر لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس وقت غیر مذاہب کو اپنے مذاہب کی طرف بلانے والے تین ہی گروہ ہیں۔ اول مسلمان دوم مسیحی اور سوم آریہ اس لئے میں اس مضمون میں سب سے پہلے فلسفہ نجات پر جو کچھ اسلام نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کو ایک حد تک مفصل بیان کروں گا۔ اور بعد ازاں مختصر طور سے غیر مذاہب کے بیانات پر کچھ تنقید کروں گا۔ اور سچے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے بعد غیر مذاہب کے دلائل کو توڑنے کی چنداں ضرورت بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ جب اسلام کا دعویٰ دلائل قطعیہ سے ثابت ہو گیا۔ تو پھر دوسرے مذاہب آپ ہی باطل ہو گئے۔ اتنا لکھنے کے بعد میں دو امر اور بھی کھول دینے ضروری سمجھتا ہوں۔

دعویٰ بادلائل ہو اول تو یہ کہ تینوں مذاہب جن کا میں ذکر کر آیا ہوں اپنے خیالات اور دعاوی کی بناء ایک الہامی کتاب پر رکھتے ہیں کہ جس کی نسبت ان کا یقین واثق ہے کہ وہ خدائے علیم وخبیر کی طرف سے ہے۔ پس جبکہ تینوں مذاہب کا یہی خیال ہے اور وہ اس پر پکے ہیں اور جو ان کی کتاب پر شک کرے اور اسے جھوٹا کہے وہ اس کو دروغ گو اور نادان کہتے ہیں۔ تو پھر ضروری ہے کہ ہر ایک مدعی اپنے مذہب کی طرف جو کچھ منسوب کرے اس کا دعویٰ اور دلیل اسی الہامی کتاب میں سے پیش کرے۔ کیونکہ جب وہ کتاب اپنے اندر کامل ہو اور ہر قسم کے دعاوی جو اس مذہب کے قیام کے لئے ضروری ہوں اس کے اندر موجود ہوں۔ اور نہ صرف دعاوی ہی بلکہ دلائل بھی وہ خود ہی دیتی ہو۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک بات خدا تو بھول گیا اور اپنی کتاب میں درج کرنے سے قاصر رہا مگر انسان اس کی مدد کے لئے اٹھا۔ اور اس نے اس

خدا کے کام کو کامل کیا اور اس طرح سے وہ بوجھ جو خدا سے نہ اٹھ سکا وہ انسان نے اٹھایا اور خدا کو اس مصیبت سے بچالیا- مثلاً جب کفارہ کا مسئلہ مسیحی صاحبان پیش کریں تو ضروری ہے کہ پہلے توریت و انجیل سے اس کا دعویٰ پیش کریں اور پھر اس کے دلائل بھی انہیں کتابوں سے پیش کریں- کیونکہ جب ایک نادان آدمی تک اپنی بات کے ساتھ دلائل بیان کرتا ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو کوئی فعل لغو نہیں کرتا ایک ایسا بڑا مسئلہ جس پر بنی نوع انسان کی نجات کا دارومدار ہو اپنی کتاب میں بیان نہ کرے اور ایک مدت کے بعد انسان کو یہ مسئلہ اپنی عقل سے بنانا پڑے- یا یہ کہ دعویٰ تو الٰہی کتاب میں ہو کہ کفارہ کا مسئلہ بھی ایک سچا اور پکا مسئلہ ہے- مگر اس کے لئے کوئی دلیل نہ رکھی ہو اور انسان کو مجبوراً اس کے لئے دلائل تلاش کرنے پڑیں- اور خدا تعالیٰ کی مدد کے لئے اسے دن رات کوشش کی ضرورت ہو- اور پھر کہیں جا کر وہ دعویٰ جو خدا تعالیٰ نے کیا تھا انسان کی مدد سے تکمیل کو پہنچے اور اس طرح خدا تعالیٰ کا انسان حامی اور مددگار بن جائے-

پس ضروری ہے کہ کل ایسے مسائل جن پر انسان کی نجات کا دارومدار ہو ان کا دعویٰ الہامی کتاب میں موجود ہو اور اس کے ساتھ دلائل بھی دیئے گئے ہوں ورنہ جیسے مقدمہ والوں کو وکیلوں کی تلاش کرنی پڑتی ہے- ایسے ہی اس کی کتابوں کے لئے بھی ایسے وکلاء کی ضرورت پڑے گی کہ جو خدا تعالیٰ کے بے دلائل دعاوی کو ثابت کریں- پس جس مذہب میں کوئی مہتم بالشان مسئلہ اعتقادی یا عملی جس سے نجات کا تعلق ہو ایسا پایا جائے گا کہ جو اس کی الہامی کتاب میں نہیں تو یا تو ہم کہہ دیں گے کہ اس مسئلہ کا تمہاری کتاب کو انکار ہے یا یہ کہ وہ الہامی کتاب ناقص ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف نقص کو منسوب کرنا ایک سخت گناہ ہے اس لئے مجبوراً کہنا پڑتا کہ یا تو وہ کتاب الہامی ہی نہیں اور یا انسانی دستبرد سے تباہ ہو گئی ہے ورنہ اگر انسان کو اجازت ہو کہ جو کچھ چاہے الہامی کتاب کی طرف منسوب کر دے اور کوئی ضرورت نہیں کہ اس میں ہو یا نہ ہو تو دنیا میں شرارت کی کوئی حد نہیں رہے گی- اور جس کا جو خیال ہو گا وہ اسے خدا کی کتاب کی طرف منسوب کر دے گا- اور اعتراض پر جواب دے گا کہ جیسے تم نے چند عقیدے بنا لئے اور الہامی کتاب میں ان کی کوئی اصل نہیں ویسے ہی میں نے بھی بنا لئے تو اس طرح ایمان اٹھ جائے گا اور امن جاتا رہے گا اور مذہب کی سچائی کا کوئی معیار نہ رہے گا اور الہامی کتابوں کی کوئی حقیقت اور وقعت نہ رہے گی- پس ہر ایک مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے چاہئے کہ انسان اس کو اپنی کتاب میں دکھائے اور پھر اس کے دلائل بھی اسی کتاب میں سے دکھائے- اور اگر دعویٰ دکھا دیا ہے تو پھر اس کے لئے دلائل بھی اسی

کتاب میں سے دکھائے تاکہ انسان پر اس الہامی کتاب کی عزت ثابت ہو۔ مثلاً یہی نجات کا مسئلہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اول تو ایک مسیحی اپنی کتاب میں سے دکھائے کہ نجات بھی کوئی چیز ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اور پھر اس کے حصول کے کون سے ذرائع ہیں اور یہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہوں۔ تو ان کے ساتھ دلائل بھی دیئے گئے ہوں ورنہ یہی کہنا پڑے گا کہ مدعی سست اور گواہ چست۔

پس اس مضمون میں انشاء اللہ جو اسلامی اصل پیش کروں گا اسے قرآن شریف سے پیش کروں گا۔ اور اس کے دلائل بھی قرآن شریف سے ہی دوں گا اور اس کی مدد میں اگر کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ ہو گی تو اسے بھی تفسیر کے طور پر پیش کروں گا۔ اور میرے خیال میں مذہبوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی راہ نہیں۔ ورنہ اگر انسان من گھڑت اعتقاد بنانے شروع کر دے۔ تو پھر مذہب تو کچھ چیز نہیں رہتا۔ اور نہ الہامی کتاب کی ہی کوئی ضرورت رہتی ہے اور بات بھی کیسی لغو ہے کہ جس خدا نے ہم کو پیدا کیا اور ہم ماں کے رحم میں تھے تو وہاں بھی ہماری پرورش کے سامان تیار کئے پھر ہم پیدا ہوئے تو یہاں ماں کی چھاتیوں میں دودھ پہلے سے تیار تھا۔ بڑے ہوئے تو ہر قسم کے خورد و نوش کے سامان مہیا پائے جس نے دن کے لئے سورج اور رات کے لئے چاند اور ستارے بنائے۔ پھر ایسا خدا جو قادر ہے جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ہر قسم کے وساوس اس پر روشن ہیں۔ کیا اس نے ہماری نجات کے ذرائع نہیں پیدا کئے اور اپنی کتاب میں بھی ان عقائد کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ جس پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے۔ اور اس کے لئے اسے اور لوگوں سے التجا کرنی پڑی کہ تم ہمارے لئے کچھ اعتقادات بناؤ کہ جن پر ہم ایمان لائیں اور ان کے لئے کچھ دلائل بھی تلاش کرو کہ تا ہم چشموں کی نظروں میں سبک اور ذلیل نہ ہوں۔ اگر مذہب کی یہی اصلیت ہے تو پھر یہ مذہب آج بھی گئے اور کل بھی گئے۔

میرے دعویٰ کی دلیل

میں اس دعویٰ کو بھی بغیر دلیل کے پیش کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے خود قرآن شریف سے اس کا ثبوت دیتا ہوں کہ قرآن شریف نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے اور اپنی سچائی کا اسے دارومدار ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (المؤمن: ۵۷) ترجمہ (وہ لوگ جو کہ اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس (خدا کی طرف سے) آئی ہو۔ بحث میں لگے

رہتے ہیں ان کے دلوں میں بڑی بڑی خواہشیں ہیں۔ جن کو وہ کبھی نہ پہنچیں گے۔ پس اللہ کی پناہ مانگتا رہ۔ وہ سب سننے والا اور سب دیکھنے والا ہے۔ ناقل) اس آیت میں خدا تعالیٰ نے مخالفین اسلام پر یہ حجت قائم کی ہے کہ جب تم مذاہب کے متعلق گفتگو کرتے ہو تو تمہارا فرض ہے کہ دعویٰ اور دلیل پیش کیا کرو۔ مگر جب کہ تم کوئی دلیل پیش نہیں کرتے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو ملی ہو تو دعویٰ باطل سے کیا حاصل بلا دلائل مباحثہ کا کیا نتیجہ۔ پس اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کل مذہبی مباحثوں کا آسان اور سہل طریق بتا دیا ہے کہ اگر فیصلہ چاہو تو سہل راہ یہ ہے کہ دلائل پیش کرو جو کہ تمہاری کتب میں دیئے گئے ہوں نہ کہ جس کی جو مرضی ہوئی عقیدہ گھڑ لیا اور شتر بے مہار کی طرح بولتے چلے گئے۔ مسیحی صاحبان میں اگر یہ عادت داخل ہوئی۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی جدت پسندی اور آئے دن کی ایجادوں کی وجہ سے ہوئی کیونکہ ان میں جہاں ہزاروں ہزار موجد اور سائنس کے علماء پیدا ہو گئے۔ وہاں پادریوں نے بھی اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے آئے دن نئے نئے عقیدے اور نئے نئے دعاوی ایجاد کرنے شروع کئے۔ مگر نہ معلوم آریہ صاحبان نے ان ایجادوں میں کہاں سے کمال حاصل کیا۔ غرض کہ یہ طرز خواہ مسلمان اختیار کریں یا مسیحی یا آریہ بہت ہی خطرناک اور ضرر رساں ہے کہ جس کے دل میں جو کچھ آیا وہ کہہ دیا۔ جس کا ثبوت تو ثبوت دعویٰ تک کتاب میں سے نہ نکلے۔ پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا جو ایک بے عیب ہستی ہے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی بھی طاقت نہ رکھے۔ اور اپنا منشاء بیان کرنے سے قاصر رہے اور انسان کا فرض ہو کہ جو دعاوی خدا تعالیٰ سے بیان کرنے میں رہ گئے تھے یا جن کے لئے اسے کوئی دلیل نہیں سمجھ میں آئی۔ ان دعاوی کو تلاش کرے اور دلائل بھی اپنی طرف سے پیش کرے۔ میرے خیال میں تو اس اعتقاد کا شخص خدا تعالیٰ کے علم اور طاقت کا منکر ہے اور مذاہب کا مصلح نہیں بلکہ مفسد ہے۔

دیکھو قرآن شریف نے کیسے بین طور سے فرمایا ہے کہ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف: ۱۱۲) یعنی قرآن شریف کوئی جھوٹی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو سچا کرنے والی ہے اس کو جو کہ آگے آیا ہے اور اس میں تو ہر ایک بات جو کہ دین کے متعلق ہے مفصل دعویٰ اور دلیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اور اس میں گمراہوں کے لئے ہدایت راستی کے طریق ہیں اور یہ تو ایمانداروں کے لئے ایک رحمت کا موجب ہے۔ ایسا نہیں کہ اس کو مان کر انسان ایک مصیبت میں پڑ جائے اور آگے من گھڑت دعاوی اور دلائل کے ساتھ اس کی مدد کرنی پڑے۔

علاوہ اس کے قرآن شریف ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق:۱۷) اس آیت میں خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کی سچائی کا ثبوت دیا ہے اور فرمایا ہے کہ قرآن شریف کی سچائی کا یہ ثبوت ہے اور اس کے خدا کی طرف سے ہونے کی یہ دلیل ہے کہ وساوس نفسانی کو کوئی انسان تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی کو کیا معلوم ہے کہ دوسرے کے دل میں کیا کیا خیالات گزرتے ہیں اور کون کون سی بات اس کے دل میں کھٹکتی ہے۔ اگر کوئی سمجھ سکتا ہے تو وہ خالق ہی ہے۔ پس جبکہ خالق ہی سمجھ سکتا ہے تو قرآن شریف کے ہماری طرف سے ہونے کی یہ دلیل ہے کہ ہم نے کل وساوس انسان کا اس میں بادلائل ردّ کیا ہے۔ اور یہ کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ کلام جو ہے تو اسی ہستی کی طرف سے ہے کہ جو خالق ہے کل انسانوں کی تبھی تو اس نے ہر ایک کے خیال کا اس میں رد کر دیا۔ ورنہ غیر تو غیر انسان تو اپنے بیوی بچے کے خیالات پر بھی آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر کس طرح ممکن تھا کہ کوئی انسان ایسی کامل کتاب اپنی طرف سے بنائے کہ جس میں کل وساوس انسان کا ردّ موجود ہو۔ اور باہر سے دعویٰ یا دلائل مانگنے کی کچھ ضرورت نہ پڑے۔ پس اس آیت میں قرآن شریف نے دعویٰ کیا ہے کہ کل دعوے اور دلائل میرے اندر موجود ہیں۔ اور میں ایک کامل کتاب ہوں اور کسی قسم کا بھی وسوسہ اور شیطانی خیال ہو اس کا جواب تدبر کرنے والے انسان کے لئے مجھ میں موجود ہو گا۔ اور کوئی اعتراض بھی ذات و صفات الٰہیہ پر نہ پڑے گا کہ جس کا جواب نہ دیا گیا ہو۔ اور کوئی حرف گیری اسلامی عقائد پر نہ کی جائے گی کہ جس کا ردّ نہ کیا گیا ہو۔ پس یہ کام خدا کے سوا اور کسی کا ہو نہیں سکتا اس لئے یہ کتاب ضرور الہامی ہے۔

اب میں کافی طور سے بتا چکا ہوں کہ قرآن شریف نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہر ایک الہامی کتاب کا فرض ہونا چاہئے کہ کل ضروری باتوں کا اس میں بیان ہو۔ اور وہ بغیر دلائل کے بیان نہ کی گئی ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے دلائل بھی آنے چاہئیں۔ اگر قرآن شریف کے بتائے ہوئے اس پاک اصول پر دنیا کاربند ہوتی تو میں خیال کرتا ہوں کہ بہت سے جھگڑے خود بخود ہی طے ہو جاتے اور کچھ لمبے چوڑے مباحثات نہ کرنے پڑتے... مگر افسوس کہ چونکہ غیر مذاہب اس نعمت سے خالی ہیں۔ اس لئے حتی المقدور وہ اس کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مگر میں نے اس پر اس لئے زور دیا ہے کہ شاید کسی سعید روح کو کچھ فائدہ پہنچے اور وہ سوچے اور غور کرے کہ کیا وجہ کہ ہم خدا کی مدد کو آئیں۔ اور وہ خود اپنی الہام کردہ کتاب کو ایسا ناقص رکھے کہ

دلائل تو دلائل دعاوی تک ہم کو خود تیار کرنے پڑیں- اور اس صورت میں پھر خدا تعالیٰ کا ہم پر کیا احسان ہوا- یہ تو ہماری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ لوگ خدا کو سمجھنے لگے ورنہ اگر ہم کوشش نہ کرتے تو خدا کی کتاب ایک بے فائدہ چیز کی طرح رہ جاتی- مگر اسلام ہی ایک مذہب ہے کہ کہتا ہے کہ تم ہماری مخلوق ہو ہم کو تمہاری مدد کی کچھ ضرورت نہیں- ہم نے اپنی کتاب کو کامل بنایا ہے- اور دعاوی اور دلائل میں ناقص نہیں رکھا- پس اگر تم ہدایت پاتے ہو تو نہ اس لئے کہ تم ہم پر احسان کرتے ہو بلکہ اس لئے کہ ہم نے تمہارے لئے سچائی کو ایسا بیّن کر کے کہہ دیا ہے کہ سوائے نادان یا شریر آدمی کے کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا- پس جس رنگ سے اسلام کو خدا تعالیٰ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے- اس طرح اسلام پر اس کے ماننے والوں کا کوئی احسان نہیں- بلکہ اسلام کا ان پر ہے- لیکن دوسرے مذاہب کا دارومدار ان کے پیرؤوں پر ہے- اگر انہوں نے ان کی خبر گیری کی اور اپنے پاس سے ان کے لئے دلائل مہیا کئے تب تو وہ کچھ بچ رہے- ورنہ جسم بے جان کی طرح زمین پر جا پڑے جو کہ ایک سچے مذہب کی نشانی نہیں- پس اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تمام دعاوی اور ان کے دلائل قرآن شریف سے ہی بیان کروں گا- وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيْمِ-

یا تو اسلام میں نجات ہے یا کسی مذہب میں نہیں

مذاہب میں جھگڑا کیوں ہے دوسری بات جو تمہید ہی میں بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں- یہ ہے کہ تمام مذاہب کا جو جھگڑا پڑتا ہے- تو صرف ایک دوسرے کو دعوت کرنے کی وجہ سے ہی پڑتا ہے- مثلاً مسیحی جب تمام دنیا کے مذاہب کے پیرؤوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں- اور اپنے مذہب کو ہی سچا سمجھ کر دوسروں کو بھی اس کے قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں- تبھی دوسرے مذاہب کو بھی اس کے ردّ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے- اگر دنیا میں کل مذاہب ایسے ہی ہوتے کہ وہ ایک دوسرے کے پیرؤوں کو اپنے اندر ملانے کی طرف توجہ نہ کرتے- یا انہیں ممنوع ہوتا تو ہرگز یہ ضرورت پیش نہ آتی کہ ایک مذہب دوسرے مذہب کی اس زور شور سے تردید کرتا- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان فرقوں میں جو دوسرے مذاہب کے پیروان کو اپنے اندر شامل نہیں کرتے- اس قسم کے مباحثات پیش نہیں آتے- مثلاً کہیں نظر نہیں آئے گا کہ یہودی اور سناتن دھرم کے پیرو ایک دوسرے کے برخلاف سختی سے مذہبی مباحثات کر رہے ہوں- مگر یہودیوں

مسیحیوں یا یہودیوں اور مسلمانوں میں اس قسم کے مباحثات بہت سے مقام پر مشاہدہ میں آسکتے ہیں۔ مگر پھر بھی کامل جوش کے ساتھ نہیں کیونکہ مسیحی یا مسلمان تو یہودیوں کو اپنے اندر شامل نہیں کرتے۔ مگر جب یہی مباحثات مسلمانوں اور مسیحیوں یا مسیحیوں اور آریوں کے درمیان دیکھے جائیں تو بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور اس کی یہ وجہ ہے کہ تینوں قومیں ایک دوسرے کو اپنے اندر شامل کرلینا جائز حق نہیں بلکہ ثواب کا کام سمجھتی ہیں اور اس لئے چاہتی ہیں کہ جس طرح ہو اپنے مدمقابل کو بھی اپنا ہم زبان بنالیں ایک مسلمان چاہتا ہے کہ کل مسیحی بھی مسلمان ہو جائیں۔ اور ایک مسیحی چاہتا ہے کہ کل مسلمان بھی مسیحی ہو جائیں۔ اور اسی طرح ایک آریہ ان دونوں گروہوں کی نسبت ایسے ہی خیال رکھتا ہے۔ گو میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ تینوں کے محرکات مختلف ہوں۔ مثلاً کوئی تو اس لئے چاہتا ہو کہ خدا تعالیٰ کا فضل میری طرح سے دیگر بنی نوع انسان پر بھی نازل ہو۔ اور وہ بھی حقیقی نجات سے بہرہ ور ہوں۔ اور دوسرا اس لئے کہ مشرق میں ہمارا قدم خوب مضبوطی سے جم جائے۔ اور تیسرا اس لئے کہ ہمارے حق میں ووٹ دینے والوں کی کثرت ہو جائے۔ اور کونسلوں میں ہمارے ممبر کثرت سے ہوں۔ اور ہماری پولیٹیکل عزت بڑھ جائے۔

مگر اس جگہ ہم کو اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے محرکات کیا ہیں۔ بلکہ ہمارا منشاء صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی خیال کے ماتحت یہ تینوں مذاہب تمام دنیا کو اپنے خیالات میں رنگین کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں تینوں گروہوں میں آپس میں زیادہ مباحثات ہوتے ہیں۔ پس اگر ثابت ہو جائے اور مسیحی اس بات کو مان لیں کہ ہمارے مذہب میں دوسرے لوگوں کا شامل کرنا جائز نہیں۔ تو فوراً ان کا یہ جوش و خروش جاتا رہے۔ اور سب پادری اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اور اگر آریہ اپنے سناتن دھرمی بھائیوں کی طرح شدھی کا ناجائز ہونا یقین کرلیں تو ابھی ان کی یہ تمام تیزی جاتی رہے۔ اور یہ جس قدر مذہبی رسالے اور اخبار نکل رہے ہیں ایک ایک کرکے سب بند ہو جائیں۔ اور کل مذہبی مباحثات یک قلم موقوف ہو جائیں۔

پس جب یہ بات ہے تو میں بھی اس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آیا مسیحیوں کو ہم سے مباحثات کرنے اور ہم کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی اجازت بھی ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں تو پھر کسی اور بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اسی طرح

آریوں کی نسبت دیکھنا ہے کہ کیا ان کے مذہب نے انہیں دوسرے لوگوں کو اپنے اندر شامل کرنے کی اجازت بھی دی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر آریوں سے بھی ہم کو بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ پس نجات کے سوال پر بحث ہی تب ہو سکتی ہے کہ اول یہ سوال حل کیا جائے کہ یہ تینوں مذاہب، تبلیغ عام کے مجاز بھی ہیں یا نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی مذہب تبلیغ عامہ کا مجاز نہیں تو پھر وہ ان مباحثات میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اول تو ہم مسیحیوں کی کتاب انجیل میں دیکھتے ہیں کہ کیا ان کو عام منادی کی اجازت بھی ہے یا نہیں۔ جس کے بعد پھر نجات کے مسئلہ پر بحث کی ضرورت ہو گی۔

انجیل سب دنیا کے لئے نہیں

اول میں مسیحیت کو دیکھتا ہوں کہ اس کے متعلق یسوع کا کیا حکم ہے کہ آیا اس کی تلقین غیر مذاہب کے لوگوں کو کی جائے یا نہ۔ سو اول ہی جو حکم مجھے انجیل میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسیح کچھ واعظ مقرر کرتا ہے اور ان کو حکم کرتا ہے کہ "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔ اور انہیں منادی کرو۔ اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی" (متی باب ۱۰ آیت ۵، ۶، ۷) چنانچہ اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یسوع غیر قوموں میں منادی کو ناجائز سمجھتا ہے کیونکہ وہ حواریوں کو خاص طور سے منع کرتا ہے کہ تم یہودی قوموں میں ہی منادی کرو مگر غیر قوموں میں مت جاؤ۔ گویا کہ وہ ایسے نجس اور ناپاک لوگ ہیں کہ ان کو اپنے مذہب کی تلقین کرنی تو الگ رہی ان کے پاس جانے سے بھی انسان ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس لئے جس قدر ممکن ہو ان سے دور رہنا ہی مناسب اور پسندیدہ ہے۔

پس جبکہ یسوع ہی غیر قوموں کی نسبت یہ حکم پاس کرتا ہے تو پھر آج مسیحی صاحبان کا کیا حق ہے کہ وہ اس پیغام کو جو یسوع خاص بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے لئے لایا تھا کل دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یسوع کی اس طرح خاص طور سے تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ حواریوں کی عادات اور مزاجوں سے اسے اس قسم کا خوف ضرور تھا کہ یہ لوگ جرأت کر کے غیر مذاہب والوں کو بھی کہیں وعظ نہ شروع کر دیں۔ سو اس نے اس خرابی کو روکنے کے لئے شروع میں ہی نصیحت کر دی کہ دیکھنا غیر مذاہب کے لوگوں میں جا کر نصیحت مت کرنا اور میری تعلیم کو ان کے سامنے مت پیش کرنا بلکہ یہی نہیں ان کے پاس تک نہ پھٹکنا پھر تعجب کی بات ہے کہ جب یسوع کا یہ فیصلہ ہے تو پھر پادری صاحبان کس برتے پر دنیا میں انجیل کی منادی کرتے پھرتے ہیں۔ اور لوگوں کو جائز و ناجائز

طریق سے اپنے مذہب میں شامل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔
ایک بات اس جگہ پر اور قابل غور ہے کہ اگر مسیحی صاحبان فرمادیں کہ یہاں تو صاف لفظ آیا ہے کہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔ اس میں سے ہمیشہ کی ممانعت کہاں سے نکال لی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ ضرور نکلتا ہے کہ جب تک یہودیوں کی کھوئی ہوئی بھیڑوں میں منادی نہ ہو جائے تب تک غیر قوموں میں منادی نہ کی جائے۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کو جب تک اپنے اندر شامل نہ کرلو تب تک دوسرے لوگوں کی طرف رخ نہ کرو۔ اور یا یہ معنی ہیں کہ انہیں ایک دفعہ خبر دیدو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک ہے۔ اور پھر تمہارا کچھ فرض نہیں۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں معنی لے کر بھی مسیحیوں پر سے الزام دور نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر یہ معنی لئے جائیں کہ جب تک یہودی مان نہ لیں اس وقت تک غیر قوموں میں تبلیغ نہ کی جائے تب بھی مسیحیوں پر اعتراض ہے کہ اب تک یہودی دنیا میں باقی ہیں۔ جب تک وہ کل کے کل تمہاری منادی میں نہ آجائیں۔ تب تک غیر قوموں میں منادی کرنا سراسر ناجائز ہے۔ اور یسوع کے حکم کے ماتحت جب تک ایک یہودی بھی صفحہ دنیا پر موجود ہے۔ تب تک مسیحی کسی اور کو اپنے مذہب کی تلقین نہیں کر سکتے۔ پس ان کا ہم لوگوں کو ابھی انجیل سنانا قبل از وقت ہے۔ پہلے اپنے خدا کے اکلوتے بیٹے کے حکم کے ماتحت کل یہودیوں کو مسیحی بنالیں تو پھر ہماری طرف رخ کریں۔
اور اگر اس کے یہ معنی لئے جائیں کہ نہیں صرف ایک دفعہ منادی کر دینی ہی کافی تھی۔ آگے کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس سے کچھ غرض نہیں۔ یہ اس کی اپنی دیانت اور امانت پر منحصر ہے۔ تو پھر بھی یہ اعتراض پڑتا ہے کہ یسوع کی کھوئی ہوئی بھیڑیں تو وہ تھیں کہ جن کو بخت نصر یروشلم کے علاقہ سے لے گیا تھا۔ چنانچہ بائبل پڑھنے والوں سے مخفی نہیں ہے کہ اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ اور وہ تمام ملک شام اور اس کے آس پاس پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب ان میں شرارتیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حدود کو انہوں نے توڑ دیا۔ اور دنیا میں بجائے امن قائم کرنے کے فساد مچانے لگے۔ تو بابل کا بادشاہ بخت نصران پر حملہ آور ہؤا۔ اور خدا نے اس کے ہاتھوں ان کو سزا دی چنانچہ بخت نصران کے دس قبیلوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا۔ اور ان کو افغانستان وغیرہ ممالک میں پھیلا دیا (چنانچہ افغان اور کشمیری انہیں کی نسلوں میں سے ہیں) اور یروشلم اور اسکے گرد و نواح میں صرف دو قبیلے رہ گئے۔ سو وہ دس قبیلے جو بخت نصر کی قید میں پڑ کر اپنے وطن سے دور جا پڑے۔ وہ بنی

اسرائیل کی گم شدہ بھیڑیں کہلائے۔ اور انہیں کے لئے مسیحؑ اپنے حواریوں کو حکم دیتا ہے کہ پہلے تم اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ حواریوں نے ان گم شدہ بھیڑوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ بلکہ یسوع کے صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد ہی فوراً غیر قوموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جو کہ قطعاً ناجائز تھا۔ پس اگر صرف منادی کے معنی ہی لئے جائیں تب بھی تو کام نہیں چلتا۔ کیونکہ حواریوں نے یسوع کے حکم کے خلاف کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھی نہیں توجہ کی۔ اور ان غریبوں کا خیال تک نہیں کیا۔ بلکہ مالدار قوموں کے پھانسنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پس ان معنوں کی رو سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کل یورپ و امریکہ کے مسیحی بے فائدہ اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں کیونکہ جب تک حواری کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش نہ کر لیتے۔ ان میں تبلیغ کرنا ہی ان کے لئے ناجائز تھا۔ اور یسوع کی اس کے لئے ممانعت تھی۔ پس یورپ اور امریکہ کے لوگ تو ایشیا کے مسیحی بنانے کی فکر میں ہیں۔ اور انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ خود وہ بھی مسیحی نہیں ہیں۔

دوم مرقس باب ۷ آیت ۲۶، ۲۷ میں لکھا ہے "کہ ایک عورت جس کی لڑکی پر بھوت سوار تھا یسوع کے پاس آئی اور یہ عورت یونانی تھی۔ اور اس نے آکر اپنی لڑکی کے چنگا ہونے کی درخواست کی۔ پھر یسوع نے اسے کہا کہ پہلے فرزندوں کو سیر ہونے دے۔ کیونکہ فرزندوں کی روٹی لے کے کتوں کے آگے ڈالنا لائق نہیں"۔ پس اس جگہ سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی تلقین تو الگ رہی۔ یسوع تو ان سے معمولی مہربانی سے پیش آنا تک پسند نہیں کرتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ تم کتے ہو۔ تمہارے آگے میں اپنے فرزندوں کی روٹی کیونکر ڈال دوں۔ پس ان آیات کو دیکھتے ہوئے بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یسوع کا منشاء دیگر اقوام میں تبلیغ کرنے کا بھی تھا۔

سوم حزقیل باب ۳۴ آیت ۱۶ میں ہے کہ "میں اس کو جو کھویا گیا ڈھونڈوں گا۔ اور اسے جو ہانکا گیا پھر لاؤں گا۔ اور اس کی ہڈی کو جو ٹوٹ گئی ہے باندھوں گا اور بیمار کو تقویت دوں گا" اس میں ایک پیشگوئی معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ گھرانے اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور ان میں ایک نبی بھیجا جائے گا کہ جو کمزوروں کو طاقتور اور بہادروں کو ضعیف کر دے گا۔ اور اس کے ہاتھ پر پھر بنی اسرائیل کی جماعت ایک ہو جائے گی۔ چنانچہ بائبل کے حاشیہ پر اس کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اس پیشگوئی کا ذکر متی باب ۱۸ آیت ۱۰ میں بھی ہے۔ جس کے دیکھنے سے یہ عبارت نظر آتی ہے کہ "ابن آدم آیا ہے کہ کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کے بچاوے"۔ جس سے معلوم ہوا کہ حزقیل نبی نے جو

پیشگوئی کی تھی- یسوع اسے اپنی نسبت بتاتا ہے- اور لوگوں پر حجت قائم کرتا ہے- کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ حزقیل نبی نے ایک پیشگوئی کی تھی- کہ ایک نبی آئے گا- جو کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈے گا- پس جب میں اس کام کے لئے آگیا ہوں- تو پھر میرا انکار کیوں کرتے ہو- پس معلوم ہوا کہ خود یسوع بھی اپنا کام بنی اسرائیل کے بارہ گھرانوں کی تلاش بتاتا ہے- پس کس طرح ہو سکتا ہے کہ جس کا کام تھا بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو ڈھونڈنے کا- وہ لگ جائے یورپ کی بھیڑوں کی تلاش میں-

کیا وہ افسر عقلمند سمجھا جاتا ہے کہ گورنمنٹ تو اسے سوڈان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے اور وہ جاپان پر حملہ کر دے- اور کیا ایسا نوکر اعتبار کے قابل ہو سکتا ہے کہ جسے کہا تو جائے کہ پینے کے لئے سرد پانی لاؤ اور وہ منہ دھونے کے لئے گرم پانی لے آئے- یا وہ دکاندار لین دین کے قابل سمجھا جائے گا کہ جس سے ٹوپی منگوائی جائے اور وہ جوتی بھیج دے- پس کس طرح ممکن ہے کہ یسوع تو بھیجا جائے بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں مگر وہ اس کام کو چھوڑ چھاڑ کر یورپ کی طرف متوجہ ہو- مگر چونکہ یہ کام ایک بہت ہی ناقص عقل اور کوتہ اندیش انسان کا ہے- اس لئے یسوع کی طرف ہم اس کو منسوب نہیں کر سکتے- کیونکہ دوسرے مقامات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر قوموں میں تبلیغ کو برا جانتا تھا- پس ہم یہی کہیں گے کہ یسوع کے صلیب دیئے جانے کے بعد کسی وقت یہ بدعت نکلی کہ غیر قوموں میں مسیحیت کی تبلیغ شروع ہوئی جو کہ بائبل کی تعلیم کے بالکل برخلاف تھی- کیونکہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یسوع صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے لئے ہی تھا اور نہ باقی دنیا سے اس کا کچھ کام نہ تھا-

چہارم متی باب ۵ آیت ۱۷ سے ۲۰ تک میں ہے کہ "یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں- کیونکہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں- ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا- جب تک سب کچھ پورا نہ ہو- پس جب کوئی ان حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے- اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھاوے آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا- پر جو کہ عمل کرے اور سکھاوے وہی آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائے گا-" اس آیت میں یسوع نے بیّن طور سے اپنا کام بتا دیا ہے- کہ میں توریت سے ایک نقطہ اور ایک شوشہ تک مٹا نہیں سکتا اور نہ مٹانا چاہتا ہوں- اور کوئی حکم جو توریت میں ہو- اس کو منسوخ کرنا میرے اختیار سے بالا ہے- یا میں ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا- اور یہ کہ نہ صرف توریت بلکہ علاوہ توریت کے مجموعہ بائبل میں

جتنے نبیوں کی کتب ہیں- ان میں سے کسی کتاب کے کسی حکم کا بھی انکار کرنے یا اسے منسوخ کرنے کے لئے میں مبعوث نہیں ہؤا- بلکہ میرا تو یہ کام ہے کہ میں ان احکام کو پورا کروں- اور جن باتوں پر لوگوں نے عمل چھوڑ دیئے ہیں- ان پر ان سے عمل کرواؤں اور جو جو غفلتیں ان میں پھیل گئی ہیں- ان کو دور کروں- اور پھر موسیٰؑ کے زمانہ کی طرح یہودیوں کو توریت کا پکا مطیع اور فرمانبردار بناؤں- اور اگر کوئی ایک حکم بھی مجھ سے چھڑوانا چاہے- تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا- اور جیسے توریت اور دوسرے انبیاءؑ کی کتب میں مذکور ہے- اسی پر عمل کروں گا- اور اپنے پیرؤوں سے عمل کرواؤں گا- بلکہ وہ کہتا ہے کہ توریت کے احکام سے تو ایک شوشہ کا ٹل جانا بھی اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ آسمان و زمین ٹل جائیں- اور دنیا غارت ہو جائے- پس ممکن ہے کہ ایک دم میں تمام زمین و آسمان برباد ہو جائیں- مگر توریت کے کسی حکم کا ٹلنا یا منسوخ ہونا محال اور بالکل محال ہے- پس اس آیت سے بہت سے مسئلوں کا خود بخود ہی حل ہو جاتا ہے- مگر اس وقت تو ہم کو صرف اس معاملہ سے تعلق ہے- کہ آیا مسیحیوں کو غیر قوموں میں تبلیغ کرنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں- سو جبکہ خود مسیح کہتا ہے کہ میں توریت یا دوسرے نبیوں کے مقولوں میں سے کسی کو بھی ردّ کرنے نہیں آیا- تو صاف بات ہے کہ ہم یہودیوں میں دیکھ لیں کہ وہ کیا اس کے متعلق رائے رکھتے ہیں-

ہم دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ توریت و دیگر صحف انبیاءؑ نے یہودیوں کو اپنے مذہب کی تلقین تو الگ غیر قوموں سے میل ملاپ کرنے تک کو منع کیا ہے- چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہودی غیر اقوام کو بہت نفرت سے دیکھتے ہیں- اور نجات کو اپنے ہی اندر مخصوص رکھتے ہیں- اور اپنے سوا دوسری قوموں کو نفرت سے غیر مختون کہتے ہیں- اور اگر ان میں یہ تعلیم نہ ہوتی- تو شاید مسیحی تعلیم بڑھنے بھی نہ پاتی اور وہیں کی وہیں رہ جاتی- مگر چونکہ یہودی تو لوگوں کو اپنے اندر شامل نہ کرتے تھے مگر مسیحی کر لیتے تھے- اس لئے ان کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی- غرضیکہ یہودیوں میں غیر قوموں کو اپنے اندر شامل کرنا ایک سخت گناہ خیال کیا جاتا تھا- اور اس حکم کے برخلاف کرنا ایک بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا- بلکہ جو ایسا کرے خود اس کے ساتھ تعلق رکھنا بھی ایک گناہ جانتے تھے- تو اس صورت میں مسیحؑ کے اپنے قول کے مطابق ہی کہ میں توریت کے احکام کا ایک شوشہ مٹانے یا منسوخ کرنے نہیں آیا- بلکہ اسے پورا کرنے آیا ہوں- چاہئے تھا کہ حواری یا جن لوگوں نے غیر مختون قوم کو اپنے اندر شامل کیا وہ اس کام سے رکتے اور بچتے- مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا- اور ان کے اس فعل سے انجیل کی عام منادی کا جواز نہیں نکلتا بلکہ نافرمانی اور محسن کشی سمجھی جاتی ہے- کتنے

ظلم کی بات ہے کہ یسوع جس کام کے لئے آیا تھا اور جس کا وہ بار بار اعلان کرتا ہے اس کو ترک کر کے اپنے من مانے کام شروع کر دیئے گئے ہیں۔ توریت اور صحف انبیاءؑ سے غیر قوموں کی منادی منع تھی۔ مسیح ان کی سچائی کو قبول کرتا ہے۔ پھر بتاؤ کہ کس حکم سے غیر قوموں سے تعلقات پیدا کرنے اور ان میں تبلیغ کرنے کا فتویٰ ملا۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف توریت کی نسبت ہی بلکہ مسیحؑ تو فقیہوں کے اقوال کی نسبت بھی کہتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ کرو پر جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ نہ کرو۔ چنانچہ فقیہی اور فریسی تو اس کام کو بہت برا کہتے تھے۔ سو ان کے اقوال کے مطابق بھی حواریوں کو ایسا کرنا ناجائز تھا۔ کیونکہ خود یسوع نے کہا ہے کہ فقیہوں اور فریسیوں کے اقوال پر عمل کرو۔

اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ یہودیوں میں غیر قوموں میں تبلیغ کرنا منع تھا مجھے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود پطرس رسول کے قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اعمال باب ۱۰ آیت ۲۸ میں اس رسول کی بابت لکھا ہے کہ اس نے ایک سردار کو جو یہودی نہ تھا۔ کہا کہ "تم جانتے ہو کہ یہودی کو بیگانے سے صحبت رکھنی یا اس کے ہاں جانا روا نہیں" جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حواری بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہودی کو دوسرے سے صحبت رکھنی روا نہیں۔ اور اپنا مذہب اسے تلقین کرنا ناجائز ہے۔ پس بموجب اس قاعدہ کلیہ کے جو یسوع نے مقرر فرمایا تھا کہ میں ایک شوشہ تک توریت سے نہ مٹاؤں گا۔ مسیحیت کی تلقین غیر قوموں میں کرنی ناجائز تھی اور ہے۔

پھر اعمال باب ۱۱ آیت ۱ سے ۳ تک لکھا ہے کہ "اور رسولوں اور بھائیوں نے جو یہودیہ میں تھے۔ سنا کہ غیر قوموں نے بھی خدا کا کلام قبول کیا۔ اور جب پطرس یروشلم میں آیا۔ تو مختون اس سے یہ کہہ کر بحث کرنے لگے۔ کہ تو نامختونوں کے پاس گیا۔ اور ان کے ساتھ کھایا" اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یسوع کے صلیب پانے کے بعد تک حواریوں کا یہی خیال تھا کہ نامختونوں اور غیر قوموں میں تبلیغ ناجائز ہے۔ جس سے یہودیوں کا مذہب خوب معلوم ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یسوع نے صلیبی واقعہ تک اپنے پہلے حکم کو غیر قوموں میں تبلیغ نہ کرنا موقوف نہیں کیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ کھلی یہ بات ہے کہ اعمال باب ۱۱ آیت ۱۹ میں چند رسولوں کی نسبت لکھا ہے کہ وہ "پھرتے پھرتے فینیکے و کپرس اور انطاکیا میں پہنچے۔ مگر یہودیوں کے سوا کسی کو کلام نہ سناتے تھے" جس سے خوب اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہودیوں میں غیر قوموں کو ہدایت کرنا

سخت ممنوع تھا- پس خود حواریوں کے اقوال اور افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں غیر قوموں میں تبلیغ کرنا منع تھا- اور چونکہ خود یسوع نے کہا ہے کہ میں توریت اور دوسرے انبیاء کے احکام کا ایک شوشہ تک نہیں مٹاؤں گا- بلکہ وہ ابد تک قائم رہیں گے تو پھر کسی حواری کا یا ان کی کونسل کا کوئی حق نہیں کہ وہ اس قانون کو بدل سکیں خواہ کسی خواب یا الہام کی ہی بناء پر ہو کیونکہ جس کی نسبت خود خدا کا بیٹا (نعوذ باللہ) کہتا ہے کہ وہ قانون کو ابد تک نہ بدلیں گے ان کو بدلنا کسی پطرس یا شمعون کے رؤیا یا الہام کی بناء پر کسی طرح درست نہیں ہو سکتا- ورنہ دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ مان لیا جائے کہ یسوع کا علم ناقص تھا اور یا یہ کہ مذکورہ بالا کلمات انجیل میں پیچھے سے مل گئے ہیں ان دونوں حالتوں میں انجیل کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا-

پنجم ایک اور دلیل کا یہاں لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ یسوع ایک موقعہ پر حواریوں کو فرماتا ہے کہ "وہ چیز جو پاک ہے- کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سؤروں کے آگے نہ پھینکو کہ وے انہیں پامال کریں- اور پھر کر تمہیں پھاڑیں" (متی باب ۷ آیت ۶) اس آیت میں یسوع نے کیسے پر زور اور جوش دلانے والے الفاظ میں حواریوں سے التجا اور استدعا کی ہے کہ دیکھو اپنے جوشوں کو دباؤ اور نرمی سے کام لو میں جو تم کو تعلیم سکھاتا ہوں وہ موتیوں کی طرح ہے- اسے ضائع مت کرو- اسے غیر قوموں کے سامنے پیش مت کرو- کیونکہ جیسے موتیوں کی قدر کتے اور سئور نہیں کر سکتے- اسی طرح یہ لوگ بھی اعلیٰ باتوں کی قدر پہچاننے سے عاری ہیں- اور اگر تم ان کے سامنے یہ تعلیم پیش کرو گے- تو جیسے سئور موتیوں کو پاؤں میں روند ڈالتے ہیں- اسی طرح سے یہ لوگ اس تعلیم کو تباہ کر دیں گے- اور اس کی خوبی کو خاک میں ملا دیں گے- اور اس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں ملا دیں گے- یہاں تک کہ وہ موتی جو تم ان کے سامنے پیش کرو گے- وہ ان مسلے ہوئے موتیوں کی طرح ہو جائیں گے جو زمین پر روندے گئے ہوں اور ان میں اور مٹی میں کچھ فرق نہ ہو سکے گا- اور نہ صرف وہ اس تعلیم کو ہی خراب کر دیں گے- بلکہ تم پر اور مجھ پر ایسے ایسے الزام باندھیں گے کہ پھر بچنے کی کوئی راہ نہ ملے گی-

پس کیسی سچی یہ تعلیم تھی جو یسوع نے دی- اور کیا ہی پاک وہ نصیحت تھی جو اس نے کی مگر افسوس اس دن پر کہ جب حواریوں نے یا (میرے خیال کے مطابق) ان کے بعد اور لوگوں نے یسوع کے ان درد بھرے کلمات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یونانیوں اور رومیوں پر یہ مذہب پیش کیا- اور ماتم اس قوم کے لئے جس نے اپنے محسن اپنے نجات دہندہ اپنے مہربان اپنے استاد کے ارشاد

بلکہ وصیت کو یوں خاک میں ملا دیا۔ اور بت پرست قوموں کے سامنے مسیحیت کو پیش کیا۔ وہ لوگ جن کی گھٹی میں ہی بت پرستی پڑی ہوئی تھی وہ کب اس مذہب میں داخل ہو کر اسے ترک کر سکتے تھے۔ اگر پہلے محبت اور غضب اور وقت اور قسمت کے بت پوجتے تھے۔ تو اب انہوں نے یسوع اور مریم کے بتوں کے آگے سر جھکا دیئے۔ اور اسی طرح وہ تعلیم جو توحید سکھاتی تھی سب سے زیادہ بت پرستی کی تلقین کرنے والی تعلیم ہو گئی اور وہ یسوع جس نے کہ قوم کی خاطر بڑے بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ اس کو انہوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ ملعون قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسی طرح پہلے نوشتوں کا کلام پورا ہوا "کہ اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو کہ وہ انہیں پامال کریں۔ اور پھر کر تمہیں پھاڑیں"۔ یسوع کے احسانات فراموش کر دیئے گئے۔ اس کی کل نیکیاں بھلا دی گئیں۔ اس کی کل مہربانیاں نظر انداز کر دی گئیں۔ اور وہ قوم کا مصلح بغیر کسی جرم کے ملعون قرار دیا گیا اور اس کے پیروان نے اس کی تعلیم کو غیر قوموں کے سامنے پیش کر کے اسے پھڑوایا اور گالیاں دلوائیں۔ سچ ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ یسوع کے اپنے ہی شاگردوں نے سادگی کی وجہ سے بت پرستوں کے آگے موتی ڈال دیئے جنہوں نے ان کو روندا اور خود ان کے استاد کو پھاڑا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی حملہ ہو سکتا ہے کہ ایک فدائے قوم اور نیک آدمی کو من مانے عیش اڑانے کے لئے ملعون قرار دیا۔ گو پراٹسٹنٹ فرقہ نے کچھ اصلاح کی مگر کس طرح ممکن تھا کہ نوشتوں کا لکھا ٹل جائے۔

اب میں اس مسئلہ کو لمبا کرنا نہیں چاہتا میں انجیل سے اچھی طرح ثابت کر آیا ہوں کہ مسیحی تعلیم کا غیر قوموں میں پھیلانا نہ صرف ممنوع ہے بلکہ خطرناک گناہ ہے۔ پس جبکہ انجیلی نجات سوائے یہودیوں کے اور لوگوں کے لئے ہے ہی نہیں تو مسیحی بننا ہی بالکل لغو اور بیہودہ فعل ہے۔ اور ان کا نجات کے مسئلہ پر لوگوں سے بحث کرنا ہی فضول۔

آرین تعلیم بھی عام نہیں

اس کے بعد میں آرین تعلیم کو لیتا ہوں مگر اسے میں زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہتا اور اگر کروں تو بھی بڑی مشکلات ہیں کیونکہ یہ لوگ تاریخ سے نابلد رہے ہیں۔ ان کی کوئی بات سچی ملتی ہی نہیں۔ جو مرضی آئے یہ کہہ دیں وہ سب سچ۔ مگر غیر مذاہب والے اگر ان کی پچھلی کتابوں یا قدیم نشانات سے کوئی واقعہ نکال کر ثابت کر دیں تو وہ سب بالکل غلط اور نادرست ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ وید کا کوئی ترجمہ صحیح نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ پنڈت دیانند نے جو کچھ لکھا اس میں دشمنوں کی دست برد ہمیشہ ہوتی رہی۔ تاریخ دانی کا یہ حال ہے

کہ ان کے ایک اخبار نویس لکھتے ہیں کہ بکرماجیت سے بھی پہلے ایک راجہ تھا۔ جس نے سرحد پر حملہ کرکے مسلمانوں کی لڑکیاں چھینی تھیں گویا کہ آنحضرت ﷺ سے بھی سات آٹھ سو برس پہلے مسلمان سرحد پر رہا کرتے تھے۔

مگر پھر بھی چونکہ تنقید کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے مگر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہے کہ بقول ان کے دنیا کروڑوں برس سے چلی آرہی ہے۔ تو اتنی مدت میں صرف آج پنڈت دیانند کو یہ بات سوجھی کہ وید سب دنیا کے لئے ہے۔ اور جس قدر رشی منی گزرے ہیں سب اس سمجھ سے خالی تھے۔ تو پھر یہ بڑا پاپ اور ظلم ہے کہ وہ تعلیم جو ساری دنیا کے لئے تھی وہ پرماتما نے صرف ہند میں مخصوص کر چھوڑی اور یہی نہیں بلکہ صرف آرین قوم کے لئے خاص کردی جب کروڑوں برس سے تمام ہندو رشی، منی یہی کہتے آئے ہیں تو آج پنڈت صاحب کو ہم کس طرح مان لیں کہ یہ درست کہہ رہے ہیں۔ کیوں نہ کہیں کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کو دیکھ کر آپ کو بھی شوق چڑھ آیا کہ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ کیوں نہ وید کو بھی تمام دنیا کے لئے بتائیں بے شک ایک رنگ میں تو وید تمام عالم کے لئے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ سے پرے کچھ نہیں۔ بس دنیا وہاں ختم ہے۔ تو اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وید سب دنیا کے لئے اترا تھا۔ کیونکہ جب دنیا ہندوستان کا ہی نام ہے۔ تو بیشک وید سب دنیا میں شائع ہو چکا ہے اور ہمیشہ سے اس کی تعلیم دنیا کے (یعنی ہندوستان) کے ہر کونہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مان لینے میں ہم کو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر دنیا سے مراد کل عالم لیا جائے تو پھر ہم وید کو کل دنیا کے لئے نہیں مان سکتے اور نہ خود ہندوؤں کی کتابیں ہم کو اس بات کی اجازت دیتی ہیں۔

مگر اصل بات یہی ہے کہ جب سے آرین لوگ ہندوستان میں آئے ہیں اور جب سے کہ وید تصنیف ہوئے ہیں۔ اسی وقت سے ان کی تعلیم کو ہندوؤں میں خاص رکھا گیا اور شودروں کے لئے ایسے سخت قانون بنائے گئے کہ ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنے سوا دوسرے لوگوں کو کیا سمجھتے تھے۔ چنانچہ حکم تھا کہ اگر کوئی شودر وید کو سن لے یا خود بھی نہ سنے اس کے کان میں ہی آواز پڑ جائے تو اس کو سخت سزائیں دی جائیں اور کان کاٹ دیئے جائیں آنکھیں نکال دی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ اور وید کو چھونے پر تو بہت ہی سخت سزائیں ملتی تھیں۔ پس ایسی حالت میں یہ کہنا کہ وید سب دنیا کے لئے ہے کہاں تک ٹھیک ہو سکتا ہے۔ جب آریوں کے بزرگوں کا عمل اور ان کی کتب

ہم کو یہ واقعات بتا رہی ہیں- تو پھر زبان سے وید کو کل عالم کے لئے کہہ دینے سے تو کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا- اگر کوئی تعلیم وید کی ایسی ہوتی کہ جس میں سب دنیا کی ہدایت کا اقرار ہوتا تو آخر اس اربوں برس میں کوئی رشی منی یا اوتار تو اس دھرم کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا اور کہتا کہ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ سب دنیا کو ہدایت کرو' پھر اس کتاب کو اپنے گھر میں کیوں چھپائے بیٹھے ہو- اور اگر جب سے وید نازل ہوئے ہیں- سب ہندو دھرم سے دور اور ہدایت سے خالی ہی رہے ہیں- اور کسی کو بھی ہندوستان سے باہر کے لوگوں کی حالت پر رحم نہیں آیا- اور نہ وید کی تعلیم کی حمایت کا ہی جوش پیدا ہؤا تو ایسی کتاب جس نے دو ارب برس میں ایک کو بھی ہدایت نہ کی- آج اس سے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں- اور ہماری نجات کے لئے وہ کیا کر سکتی ہے-

غرض کہ وید نہ تو تمام دنیا کے لئے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے- اور نہ ہی اس کی وجہ بتاتا ہے اور علاوہ اس کے وید اب تک ہندوستان سے باہر نہیں پھیلایا گیا- اور ہمالیہ سے باہر اس کی تلقین نہیں ہوئی- اور شاستروں سے معلوم ہوتا ہے- کہ وید کو غیر قومیں سنیں تک نہیں- اور خود ہندو بزرگوں کا عمل یہی ظاہر کرتا ہے چنانچہ آریہ قوم کے سوا جو کہ بہت تھوڑی تعداد میں ہے- اور لاکھوں سے نہیں بڑھتی قریباً کل فرقے اس بات کے قائل ہیں کہ وید کا باہر نکالنا اور غیر قوموں کو اپنے اندر شامل کرنا بالکل ناجائز ہے- اور گناہ عظیم ہے- تو اس صورت میں آریوں کا نجات کا دروازہ تمام دنیا کے لئے کھلا ثابت کرنا بالکل غلط ہے- اور ان کو کوئی حق نہیں کہ غیر قوموں میں اپنے مذہب کی تلقین کریں-

اسلام سب دنیا کے لئے ہے

میں دیکھتا ہوں کہ تمہید بہت لمبی ہوتی جاتی ہے- مگر پھر بھی ضروری ہے کہ میں قرآن شریف سے اس بات کا دعویٰ دکھاؤں کہ وہ سب دنیا کے لئے ہے- اور یہ کہ آنحضرت ﷺ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے خاتم النّبیّن ہو کر مبعوث ہوئے ہیں- اور اب تک جس کو تیرہ سو برس گزر گئے ہیں یا آئندہ آپ ؐ کی غلامی سے منکر شخص کی رسائی دربار الٰہی میں نہیں ہو سکتی-

چنانچہ اول ہی اول جو آیت ہم کو سورۃ فاتحہ میں نظر آتی ہے وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے جس کے معنی ہیں کہ سب تعریف ہے اس کے لئے جو سب دنیا کا رب ہے یعنی پرورش کرنے والا ہے-- جس میں کہ ہم کو بتایا گیا ہے کہ شکر کرو اس خدا کا جس نے وہ کتاب بھیجی کہ جس نے پہلی سب کتابوں کو موقوف کر کے جو مختلف قوموں کے لئے تھیں اس کتاب کو ارسال کیا کہ جو ربوبیت

عالمین کی صفت کے ماتحت اب سب دنیا کی ربوبیت کرے گی۔ اور خواہ کسی مقام کا رہنے والا آدمی ہو سب کے لئے اس نے اپنے دروازوں کو کھول دیا ہے۔ اور کسی دکھیارے کو رد نہیں کرتی اور کسی سائل کو دھتکارتی نہیں۔ نہ کسی ملک کے ساتھ اپنے آپ کو مخصوص کرتی ہے۔ چنانچہ یہ وہ آیت ہے کہ مسلمان اس کو دن میں کم سے کم چالیس دفعہ تو پڑھ ہی چھوڑتے ہیں۔

علاوہ اس کے سورۃ انعام کے رکوع ۲ میں خدا تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو کہہ دے کہ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ (الانعام: ۲۰) یعنی وحی کیا گیا ہے میری طرف یہ قرآن تاکہ میں تم کو اس سے ڈراؤں اور اس کو ڈراؤں جس کو یہ پہنچے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن ہر ایک شخص کے لئے ہے۔ اور کسی قوم یا ملک کی خصوصیت نہیں جس کے کان میں یہ پڑے وہی مخاطب ہے اور کوئی نہیں جو کہہ سکے کہ میں تو اس کے مخاطبین میں سے نہیں ہوں۔ بلکہ جس کو یہ پہنچ جائے اسی کو آنحضرت ﷺ کے دعویٰ کی طرف جھکنا پڑے گا۔ اور سستی یا شرارت پر کوئی عذر نہ سنا جاوے گا۔ چنانچہ اس آیت میں ایک پیشگوئی بھی ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو فرماتا ہے کہ قرآن شریف کے منکرین کے لئے جو سزائیں بتائی گئی ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ جو شرارت کرے گا اور اس کتاب سے ٹھٹھا کرے گا وہ ہلاک ہو گا اور دنیا میں ذلیل ہو گا۔ وہ صرف اہل عرب کے لئے نہیں بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں یہ جائے گا وہیں اس کے مقابلہ کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے۔ اور ان کے لئے بھی نذیر ہو گا۔ چنانچہ اس لئے فرمایا کہ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ یعنی تاکہ انذاری پیشگوئی تم کو بھی اور جن کو یہ پہنچے ان کو بھی سنادی جائے۔ اور یہ قرآن شریف کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور آیت ہے کہ جس کے مقابلہ میں اور کوئی کتاب نہیں ٹھہر سکتی چنانچہ آتھم اور لیکھرام نے اس پیشگوئی کے مطابق اپنا انجام دیکھ لیا اور اس پیشگوئی کے شاہد بنے اور دیگر لوگوں نے بھی اس کا مشاہدہ کیا۔ پس علاوہ اس کے کہ اس آیت سے یہ نکلتا ہے کہ قرآن شریف سب دنیا کے لئے ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کو یہ پہنچے اس کے لئے یہ انذار ساتھ موجود ہے۔ کہ اس شہنشاہی پروانہ سے اگر ٹھٹھا کرو گے۔ تو آنحضرتؐ اسی لئے آئے تھے کہ سب دنیا کو کہہ دیں کہ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ۔

علاوہ ازیں سورۃ اعراف رکوع ۲۰ میں ہے کہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا اِۨلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف: ۱۵۹) یعنی ان کو کہہ دے کہ ایک دو کے لئے نہ کسی خاص قوم کے لئے اور نہ ہی کسی خاص ملک کے لئے بلکہ میں دنیا کے ہر گوشہ کے

باشندوں کے لئے مبعوث ہو کر آیا ہوں- اور میرا بھیجنے والا اللہ ہے- جو کہ آسمان و زمین کا بادشاہ ہے اور مالک ہے- اس لئے میری بات کو ہلکا مت خیال کرو بلکہ یاد رکھو کہ اگر تم نے میرا مقابلہ کیا تو لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ- ملک اسی کا ہے وہ تم سے فوراً چھین لے گا- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا جس نے مقابلہ کیا وہ ذلیل ہؤا اور علاوہ اور ذلتوں کے ملک بھی خالی کرنا پڑا پھر آپؐ کے سچے متبعین حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے زمانوں میں بھی جو کوئی سامنے آیا ذلیل ہؤا اور خائب و خاسر ہوا- چنانچہ اس وقت تو اور رنگ تھا اب بھی پادری صاحبان نے جس وقت سے اسلام کے برخلاف منہ زوری کرنی شروع کی ہے اس وقت سے یورپ سے پادریوں کی حکومت مٹتی جاتی ہے- اور اب صرف چند جگہ ہی رہ گئی ہے- ورنہ کل یورپ میں ان کا سکہ چلنا بند ہو گیا ہے- وہ طاقتیں جو کروڑوں روپیہ ان کی مدد کے لئے خرچ کرتی تھیں اب روپیہ دینا تو الگ خود ان سے وصول کرنا چاہتی ہیں- انگلستان سے ان کا دخل اٹھ گیا- فرانس و بلجیم سے ان کا دخل اٹھ گیا- جرمن سے ان کو جواب ملا- ایشیا میں ان کی ذلت ہوئی تو امریکہ نے ان کی اطاعت کا جوا اتار کر پھینک دیا- چنانچہ تاریخ کو اٹھا کر دیکھو کہ جس وقت سے اسلام کے برخلاف انہوں نے زہر اگلنا شروع کیا ہے اور قرآن شریف کی ہتک پر کمر باندھی ہے تبھی سے ان پر تباہی آنی شروع ہوئی ہے- اور کہاں تو بادشاہ تک پادریوں سے ڈرتے تھے- اور کہاں مذہب کے برخلاف فیصلے ہو رہے ہیں اور اگر پادری صاحبان کچھ چوں چرا کریں تو گورنمنٹ تو الگ عوام تک بھی گرجا پھونک دیتے ہیں- لمبی تحقیقات تو تاریخوں سے ہو سکتی ہے- میں ایک واقعہ یہاں لکھ دیتا ہوں جس سے میری تصدیق ہوتی ہے- ڈاکٹر جے- ایف آرنلڈ مسلم مشن سوسائٹی کے آنریری سیکرٹری کی کتاب اسلام اور عیسائیت سے جو کہ ۱۸۷۴ء میں چھپی ہے- ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اول مسلمانوں کے برخلاف اگر کوئی باقاعدہ سوسائٹی تیار ہوئی ہے- تو وہ ۱۸۲۲ء میں بیل کے مقام پر ہوئی ہے- (جو کہ غالباً سوئٹزرلینڈ میں ہے) چنانچہ اس سوسائٹی نے ایک ہزار سے زائد مشنری ادھر ادھر بھیجے تھے- مگر یہ سوسائٹی بہت جلد ۱۸۳۳ء میں گورنمنٹ کے حکم سے ملک بدر کی گئی- چنانچہ ڈاکٹر فنڈر جو میزان الحق کا مصنف ہے- وہ بھی اس گروہ کے ساتھ یورپ سے بھیجا گیا تھا- مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے فوراً ہی اس سوسائٹی کو مفسد قرار دلوا کر ذلت کے ساتھ ملک بدر کرا دیا- مگر چونکہ پادری صاحبان نے نصیحت حاصل نہیں کی اس لئے آج ہم دیکھتے ہیں تو یورپ میں کہیں- یونیٹرین فرقہ کا زور ہے- جو یسوع کی ابنیت پر سو سو قہقہہ لگاتا

ہے۔ تو کہیں فری تھنکر پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا کام ہی پادری صاحبان کو گالیاں دینا اور ان کے راز پوشیدہ کو ظاہر کرنا ہے۔ مگر یہ باتیں بھی کچھ نہ تھیں اگر یورپ مسیحیت پر قائم رہتا مگر جو لوگ یورپ سے دنیا کو نجات دینے کے لئے نکلے تھے۔ ان کے اپنے وطن میں اسّی فی صد سے بھی زیادہ لوگ دہریہ ہو گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے جہاں جہاں پادریوں کا کچھ اختیار تھا۔ ان کو اس سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ یہ اس آیت کے ماتحت ہے کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بیشک سب کچھ خدا ہی کا ہے۔ وہ اس پاک کتاب پر ٹھٹھا کرنے والوں کو بغیر سزا کے نہیں چھوڑتا مگر اس کو جو توبہ کرے۔

تیسری آیت اس بارے میں سورۃ سبا کے رکوع ۳ میں ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا:۲۹) یعنی ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لئے کہ اب تمام دنیا کے لئے ایک نبی کی ضرورت تھی اور وہ اس بات کی محتاج تھی کہ بجائے الگ الگ نبی آنے کے ایک ہی نبی آئے جو کامل اور مکمل ہو جس کے وجود پر تمام دنیا کی ہدایت کا دارومدار ہو اور جس کے توسط سے لوگ اس خالق حقیقی تک پہنچیں کہ جس تک پہنچنا تمام بزرگیوں سے بزرگ تر اور تمام انعامات سے بڑا انعام ہے۔ اس لئے ہم نے تجھ کو اس کام کے لئے چنا اور بشیر و نذیر بنا کر مبعوث کیا۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں اور تیری بے کسی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ شخص جو ایسا کمزور اور غیر مشہور ہے۔ اس کی تعلیم اور ہدایت تمام دنیا میں کس طرح پہنچے گی۔ اور کس طرح تمام دنیا کے لئے بشیر و نذیر ہو جائے گا۔ ایک ہمارا مقابلہ تو یہ کر نہیں سکتا۔ پھر سب دنیا میں اس کے پیرو کس طرح پھیل جائیں گے اور یہ چند آدمی بڑھتے بڑھتے کل دنیا کا احاطہ کس طرح کر لیں گے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ ان لوگوں کے خیالات و اقوال کو اس طرح ظاہر فرماتا ہے کہ جب مخالفین اسلام نے آنحضرت ﷺ کا یہ قول سنا کہ میں سب دنیا کے لئے مبعوث ہؤا ہوں اور سب کے لئے بشیر و نذیر ہو کر آیا ہوں اور میری تعلیم ہر جگہ پھیل جائے گی تو وہ حیران ہوئے وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سبا:۳۰) یعنی اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہو گا اور کب آپ کی بشارت اور آپ کا انذار تمام دنیا میں پھیل جائے گا۔ اور آپ کے دشمن ذلیل اور پیرو باعزت ہوں گے۔ اس پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (سبا:۳۱) ان کو کہہ دو کہ دوسروں سے تم کو کیا اپنی سنو کہ تمہارے لئے ایک یوم (جو الہامی کتب میں ایک قلیل مدت سے مراد ہوتی ہے) کی مدت مقرر ہو چکی ہے۔ اب اس مدت کے

اندر اندر تم کو تو انذار سنا دیا جائے گا۔ اور موقعہ بدر پر تم کو اس انکار کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ باقیوں کا معاملہ خدا کے سپرد ہے جب ان کا موقعہ آئے گا ان تک بھی یہ کلام پہنچ جائے گا۔ ہاں تمہارا واقعہ ان کے لئے ایک عبرت کا کام دے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے بدر کے موقعہ پر اپنی قسمت کا انجام دیکھ لیا اور کچھ مدت کے اندر اندر ہی اسلام دنیا میں پھیل گیا جو کہ ایک عقلمند کے لئے ایک بڑی آیت ہے۔ جو مذکورہ بالا آیت کے مطابق پوری ہوئی۔

پھر چوتھی آیت میں جس میں آنحضرت ﷺ کے عہدہ کی میعاد بیان کی گئی ہے کہ کب تک آپؐ کا مذہب قائم رہے گا۔ یہ ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (سورۃ احزاب: ۴۱) یعنی نہیں ہیں آنحضرت ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور رسول بھی کیسے کہ خاتم النبیّن ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کا جاننے والا ہے۔ اور کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیّن ہیں۔ اور آپؐ کے بعد اب کوئی شخص نہیں آئے گا کہ جس کو نبوت کے مقام پر کھڑا کیا جائے۔ اور وہ آپؐ کی تعلیم کو منسوخ کر دے اور نئی شریعت جاری کرے بلکہ جس قدر اولیاء اللہ ہوں گے اور متقی اور پرہیز گار لوگ ہوں گے سب کو آپؐ کی غلامی میں ہی ملے گا جو کچھ ملے گا۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے بتا دیا کہ آپؐ کی نبوت نہ صرف اس زمانہ کے لئے ہے۔ بلکہ آئندہ بھی کوئی نبی اور نہیں آئے گا بلکہ اب ہمیشہ کے لئے آپؐ کی ہی تعلیم جاری رہے گی۔ اور یہی لوگوں کی ہدایت کا موجب ہوگی جو اس سے باہر نکلے گا وہ درگاہ الٰہی میں نہیں پہنچ سکے گا۔

اس جگہ ایک اور نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا مگر بظاہر اس جگہ اس کا جوڑ کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر باتیں بیان فرمائی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ان کے لئے یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کا جاننے والا ہے کچھ ضروری نہ تھا۔ سو اصل بات یہ ہے کہ یہاں آپؐ کے خاتم النبیّن ہونے کے متعلق ایک پیشگوئی ہے۔ اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے دنیا میں سینکڑوں نبی گذرے ہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔ اور جنہوں نے بڑی بڑی کامیابیاں دیکھیں بلکہ کوئی صدی نہیں معلوم ہوتی کہ جس میں ایک نہ ایک جگہ مدعی نبوت نظر نہ آتا ہو۔ چنانچہ کرشنؑ، رام چندرؑ، بدھؑ، کنفیوشسؑ، زرتشتؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ تو ایسے ہیں کہ جن کے پیرو اب تک دنیا میں موجود ہیں۔ اور بڑے زور سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور

ہر ایک اپنی ہی سچائی کا دعویٰ پیش کرتا ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ کے دعویٰ کے بعد تیرہ سو برس گزر گئے ہیں کہ کسی نے آج تک نبوت کا دعویٰ کر کے کامیابی حاصل نہیں کی۔ آخر آپؐ سے پہلے بھی تو لوگ نبوت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور ان میں سے بہت سے کامیاب ہوئے۔ (جن کو ہم تو سچا ہی سمجھتے ہیں) مگر آپؐ کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ کیوں بند ہو گیا۔ اب کیوں کوئی کامیاب نہیں ہوتا صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی پیشگوئی ہے کہ آپؐ خاتم النّبیّن ہیں۔ اب ہم اسلام کے مخالفین سے پوچھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کیا نشان ہو سکتا ہے کہ آپؐ کے دعوے کے بعد کوئی شخص جو مدعی نبوت ہؤا ہو کامیاب نہیں ہوا۔ پس اس کی طرف اشارہ تھا کہ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا یعنی ہم نے آپ کو خاتم النّبیّن بنایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آپؐ کے بعد اب کوئی نبی نہ آئے گا اور کوئی جھوٹا آدمی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرے گا کہ ہم اس کو ہلاک نہ کر دیں۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی پیشگوئی ہے کہ اس کا ردّ کسی سے ممکن نہیں۔ اگر ہے تو ہمارے سامنے پیش کرو۔ مگر اس طرح نہیں کہ کسی نے دعویٰ کیا ہو۔ اور لاکھ دو لاکھ اس کے پیرو ہو گئے۔ بلکہ ایسا آدمی کہ جس نے آنحضرت ﷺ یا آپؐ سے پہلے نبیوں کی طرح کامیابی حاصل کی ہو مگر کوئی نہیں جو ایسی نظیر پیش کر سکے۔

غرض قرآن شریف نے بڑے زور سے دعویٰ کیا ہے کہ میں تمام دنیا کے لئے آیا ہوں اور ہر زمانہ کے لئے ہوں مگر برخلاف اس کے جیسے کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں۔ دوسری کتب کا یہ دعویٰ نہیں۔ اس لئے ان کا دعویٰ کرنا کہ ہم نجات سب عالم کے لئے پیش کرتے ہیں۔ کسی طرح بھی درست نہیں اور ان کا کوئی اختیار نہیں کہ اپنی تعلیم غیر مذاہب کے سامنے پیش کریں۔ اور جب ان کو ان کی کتب اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتیں تو ہمارے سامنے ان کا اپنی نجات کو پیش کرنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ ان کی نجات تو انہیں تک محدود ہے اور اسلام کی نجات سب دنیا کے لئے ہے۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اس لئے سچی بات یہ ہے کہ اصل نجات وہی ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں میری غرض اس مضمون کو اس جگہ لکھنے سے صرف یہی ہے کہ میں بتاؤں کہ ان لوگوں کی کتب ان کو اجازت ہی نہیں دیتیں کہ یہ اپنی نجات دوسروں کے سامنے پیش کریں۔ پھر ہمارا ان کا مقابلہ کیا چنانچہ میں نے ہر ایک مذہب کے متعلق الگ الگ ثابت کیا ہے کہ سوائے اسلام کے مسیحیت اور آرین مذہب کا غیر قوموں میں پھیلانا بالکل خلاف اصول ہے۔ اور منع ہے چنانچہ اس لئے ان کا ہم سے نجات کے بارے میں بحث کرنا خلاف اصول ہے۔

اب میں اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں اور سب سے پہلے یہ بتاتا ہوں کہ اسلامی نجات کیا ہے۔ اور یہ کہ واقعی وہی نجات سچی اور حقیقی ہے۔ اور باقی سب مذاہب کی پیش کردہ نجاتیں ناقص ہیں۔

نجات کی تعریف

ہر ایک مضمون پر قلم اٹھانے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تشریح کر دی جائے اور تعریف کر دی جائے تاکہ ایک تو مضمون کے حصہ کرنے میں آسانی ہو۔ اور ایک پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں مدد ملے۔ اس لئے میں لفظ نجات کی تحقیقات کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔

یاد رہے کہ نجات ایک عربی زبان کا لفظ ہے کہ جس کے معنی دریافت کرنے کے لئے ہم کو عربی لغات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اول لفظ نجات کے وہ معنی جو لغت عربی ہم کو بتاتی ہے لکھ دوں۔

تاج العروس جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۶ پر لکھا ہے کہ اَلنَّجَاۃُ الْخَلَاصُ مِمَّا فِیْہِ الْمَخَافَۃُ وَنَظِیْرُھَا الْمَلَامَۃُ ذَکَرَہُ الْحَرَالِیْ وَ قَالَ غَیْرُہٗ ھُوَ مِنَ النَّجْوَۃِ وَ ھِیَ الْاِرْتِفَاعُ مِنَ الْھَلَاکِ وَ قَالَ الرَّاغِبُ اَصْلُ النَّجَاۃِ الْاِنْفِصَالُ مِنَ الشَّیْءِ وَ مِنْہُ نَجَا فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ اب اس صورت میں نجات کے تین معنی ہوئے۔ ایک تو خوف والی چیز سے خلاصی دوسرے یہ کہ ہلاکت کی جگہ سے اونچا کر دینا اور ٹیلہ پر جگہ دینا اور تیسرے کسی چیز سے جدا ہو جانا مگر بہرحال ہم کو ان تینوں معنوں سے اتنا معلوم ہو گیا کہ نجات کہتے ہیں کسی مکروہ چیز سے بچ جانے کو۔ پس اب ہم مذاہب کو دیکھتے ہیں تو ان کا اصل مقصد خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے انسان کو بچانا اور اس سے سچا تعلق پیدا کروانا ہوتا ہے۔ اس لئے مذاہب نے جو یہ لفظ لیا ہے اور استعمال کیا ہے تو انہوں نے اس کو انہیں مذکورہ بالا معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور نجات کے لفظوں کو اپنی اصطلاح میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے اور اس کی رضا حاصل کرنے پر حصر کیا ہے۔ اور واقعی اگر دیکھا جائے تو اصل خوف تو خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ راضی ہے تو پھر ہر ایک آفت سے انسان محفوظ ہے اور اگر وہ ناراض ہے تو ساری دنیا کی نعمتیں موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی سکھ اور چین اور آرام نصیب نہیں ہو سکتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ خدا راضی ہو تو کل جہان راضی ہوتا ہے اور اگر وہ ناراض ہو تو اور تو اور خود اپنے ہاتھ پاؤں تک نافرمان اور قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی چیز سے ڈر ہو سکتا ہے تو وہ غضبِ الٰہی ہے۔ پس کل مذاہب نے غضب الٰہی سے بچنے اور

رضائے الٰہی کے حصول کا نام نجات رکھا ہے۔ اور اس حد تک کل مذاہب متفق ہیں۔ لیکن دوسرے قدم پر اختلاف شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض مذاہب تو ایک بات پیش کر کے کہتے ہیں کہ جس کو یہ حاصل ہو جائے تو وہ خدا کی ناراضگی سے نجات پا گیا دوسرے اس کے برخلاف کوئی اور بات پیش کر کے کہتے ہیں کہ نہیں جب تک اس درجہ کو انسان حاصل نہ کرے تب تک نجات ناممکن ہے۔ پھر اس بات پر جھگڑا اٹھتا ہے کہ ایک شخص اگر گناہ کرتا رہا اور ایک خاص وقت تک خدا تعالیٰ سے باغی رہا تو اب اس کی توبہ قبول کر کے نجات ملے گی یا نہیں اور اگر ملے گی تو کس طرح؟ اسی طرح اور بہت سے مسائل ہیں کہ جن پر مختلف مذاہب آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ نجات کے حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر غور کیا جائے۔ کیونکہ ہر ایک مذہب کا پیرو جب اس لفظ کو استعمال کرتا ہے تو اپنے عقائد کے ماتحت وہ اس لفظ کے ایک خاص معنی اپنے دل میں رکھتا ہے۔ چنانچہ جب ایک عیسائی اس لفظ کو استعمال کرے گا تو وہ اس سے یہ مراد لے گا کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کے ذریعہ نجات نہیں ہوتی بلکہ کفارہ مسیح پر ایمان لانے سے نجات ہوتی ہے۔ اور ایک آریہ جب اس لفظ کو استعمال کرے گا تو اس کا مقصد یہ ہو گا کہ پچھلے گناہوں کی سزا بھگتے بغیر انسان نجات پا ہی نہیں سکتا اور جب تک کہ وہ مختلف طرح کی جونوں کے چکر میں پھنس کر اپنے گناہوں کا کفارہ نہ کرے تب تک کسی قسم کی مکتی کی امید کرنی اس کا خیال خام ہے۔ یا ایک مسیحی جب نجات کا ذکر کرے گا۔ تو وہ اس بات پر پکا ہو گا۔ کہ گناہگاروں کے لئے دوزخ ابدی ہے۔ اور آریہ نیکیوں کے لئے مکتی کو ابدی قرار نہ دے گا۔ مگر مسلمان ان دونوں کے برخلاف خیالات رکھتا ہو گا۔ پس جب نجات پر بحث کی جائے تو ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے نجات کا مضمون کامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس وجہ سے میں ارادہ رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ اپنے مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر بحث کروں کہ جن سے نجات کا مسئلہ پورا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک حصہ میں جہاں غیر مذاہب سے اختلاف ہو اس کو بیان کروں۔ اور ان کے دلائل اور اسلام کے دلائل کا موازنہ کر کے بتاؤں کہ سوائے اسلام کے باقی سب مذاہب کی پیش کردہ نجاتیں اپنے ایک حصہ یا دوسرے حصہ میں سقم رکھتی ہیں۔ اور اس وجہ سے ناقص ہیں۔ مگر چونکہ اسلام خدا کی طرف سے ہے اس لئے اسلامی نجات ہر طرح کامل اور فطرت کے مطابق ہے۔

چنانچہ اس خیال کو مدنظر رکھ کر سرِدست میرا ارادہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے عمر صحت اور طاقت دی۔ تو انشاء اللہ اس مضمون کو چھ حصوں میں لکھوں گا۔ اول یہ کہ کیا اسلام میں پچھلے گناہوں

سے نجات ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس طرح؟ دوم یہ کہ کیا اسلام انسان کے گناہوں سے پاک ہونے کا قائل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس طرح؟ سوم یہ کہ کیا اسلام مرنے کے بعد گناہوں کی معافی کا قائل ہے یا نہیں؟ چہارم یہ کہ کیا دوزخ کا عذاب غیر محدود ہے؟ پنجم یہ کہ کیا جنت کا انعام منقطع ہے؟ اور ششم خاتمہ جس میں انشاء اللہ اس مضمون کے متعلق متفرق باتوں کو بیان کیا جائے گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

کیا اسلام میں پچھلے گناہوں سے نجات ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس طرح؟

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں نجات کے مضمون کو میں نے مختلف چھ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ اور سب سے پہلے میں مذکورہ بالا ہیڈنگ پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ جب ایک انسان خدا کی طرف جھکتا ہے تو ضرور ہے کہ اسے پہلے یہی سوال پیش آئے کہ کیا میرے پہلے گناہ جو میں اب تک کر چکا ہوں وہ معاف ہو سکتے ہیں کہ نہیں؟ اور اس سوال کے حل کئے بغیر نجات پر بحث کرنا ہے بھی فضول کیونکہ جب گناہ ہی معاف نہ ہوئے تو پھر نجات کس طرح ممکن ہے۔

یاد رہے کہ اسلام ہم کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے غفار ہونے پر ہر حالت میں ایمان لائیں اور کسی وقت بھی اس کے بے پایاں فضل و کرم سے ناامید نہ ہوں۔ بلکہ ہر دم یقین کریں کہ اگر خدا تعالیٰ کے انعامات ہمارے شامل حال نہ ہوں تو ہماری زندگیاں تلخ ہو جائیں اور جینا ہمارے لئے دوبھر ہو جائے اور یہ کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کرتا ہے اور اگر سچی توبہ کی جائے جو فضل کی جاذب ہو تو ہمارے گناہوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے وہ محبت سے پُر محبت کے قابل ہستی ہے جس کے مدنظر انسان کی اصلاح ہے اس کی ہلاکت نہیں پس جس وقت انسان اصلاح کی طرف جھکتا ہے اور اپنی غلطیوں پر آگاہ ہو کر ان کے دور کرنے کی طرف توجہ کرتا ہے تو آسمان کے دروازے بھی اس کے لئے کھل جاتے ہیں اور ملاءِ اعلیٰ کی توجہ بھی اس کی اصلاح کی طرف منصرف ہو جاتی ہے پس مبارک ہے وہ جو ان باتوں پر غور کرے اور فائدہ اٹھائے۔

برخلاف اس کے مسیحی اور آرین یہ خیال کرتے ہیں کہ پچھلے گناہ قطعاً معاف نہیں ہو سکتے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب واپس نہیں لیا جا سکتا۔ اب اگر کوئی شخص اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ تو یہی طریق

ہے کہ آئندہ کے لئے گناہوں سے بچے اور پچھلے گناہوں کی سزا کا منتظر رہے (مسیحی ایک طریق گناہوں کی سزا سے بچنے کا بتاتے ہیں مگر وہ اس جگہ کچھ تعلق نہیں رکھتا اس لئے انشاء اللہ آئندہ بیان ہو گا)

پس ہمارا اور دیگر مذاہب کا اس مسئلہ میں ایک عظیم الشان اختلاف ہے جس پر بحث کرنا ضروری ہے اور چونکہ گناہوں کی معافی کا تعلق خدا تعالیٰ کی صفات سے ہے اور ساری بحث کا دارومدار اس پر آن رہتا ہے کہ آیا خدا تعالیٰ کی صفات یہ چاہتی ہیں کہ انسان کے گناہوں کو بروقت توبہ معاف کیا جائے یا اسے ضرور ہی سزا دی جائے اور باوجود اس کی ندامت اور پشیمانی کے اور آئندہ اصلاح پر آمادہ ہونے کے اس کو ہلاک کر کے چھوڑا جائے۔ اس لئے اولاً میں خدا تعالیٰ کی صفات پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

یاد رہے کہ یہی مسئلہ نہیں بلکہ جس قدر دیگر مسائل میں مذاہب کا اختلاف ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کی صفات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے چنانچہ دنیا کے مذاہب پر نظر رکھنے والے اور ان کی تحقیقات میں دلچسپی رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کل مذاہب میں جب برائیاں پڑی ہیں۔ اور طرح طرح کی بدعات داخل ہوئی ہیں تو اس کا اصل باعث یہی ہے کہ مرورِ زمانہ سے ان لوگوں میں خدا تعالیٰ کی کسی ایک صفت یا بہت سی صفات کے متعلق غلط فہمی ہو گئی جس کی وجہ سے ان کے اعمال بھی بگڑتے بگڑتے کسی اور طرز پر آ گئے مثلاً ایک فرقہ جو خدا تعالیٰ کی نسبت یہ خیال کرتا ہو کہ خدا تعالیٰ کو ذرہ ذرہ کا علم ہوتا ہے۔ اگر مرورِ زمانہ سے وہ خدا تعالیٰ کے علم کی صفت کے سمجھنے سے دھوکہ کھا جائے اور اس کا یہ خیال ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کو کلیات کا ہی علم ہے اور جزئیات کا علم نہیں۔ تو ضرور ہے کہ اسکے بہت سے عقائد ساتھ ہی بدل جائیں گے مثال کے طور پر ان کو ماننا پڑے گا کہ قیامت کو ان کے بہت سے گناہ خدا تعالیٰ کی نظر سے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے سزا سے بچ جائیں گے۔ اور وہ یہ بھی خیال کریں گے کہ خدا تعالیٰ کو دھوکہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

غرضیکہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت میں غلط فہمی ہو جانے کی وجہ سے ہی مذاہب میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور اگر سب مذاہب صفاتِ الٰہیہ اور ان کے ظہور میں متفق ہوتے تو پھر کوئی اختلاف نہ ہوتا اور سب مذاہب ایک ہی بات کے ماننے والے ہوتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوائے بہت چھوٹے چھوٹے اختلافات کے سب مذاہب ایک ہی ہو جاتے مگر چونکہ صفاتِ الٰہیہ کے سمجھنے اور ان کے ظہور کے طریقہ میں بہت کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔ اس لئے آپس میں اس قدر بُعد واقعہ ہو گیا

ہے کہ اگر ایک مذہب کو مانا جائے تو دوسرے کو ضرور ہی غلط کہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یا تو انہوں نے خدا تعالیٰ کی صفات میں کچھ کمی کر دی ہے یا زیادتی ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کیا ہندو کیا آریہ یا مسیحی یا یہودی یا زرتشتی جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اور دوزخ کو دیکھتے ہوئے اس میں کودنے کی کوشش کرتے ہیں؟ بلکہ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں تو دہریت کو چھوڑ کر باقی کل مذاہب اس طاقتور ہستی سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور مختلف طریق سے اور جائز اور ناجائز وسائل سے اسے خوش کرنے اور اپنے پر مہربان کرنے کے لئے لگے ہوئے ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ اس کی صفات میں دھوکہ کھایا ہے اور اس لئے راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔

ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے چار آدمی ایک شہر کی تلاش میں نکلیں۔ اور ایک تو ٹھیک سیدھے راستہ پر چلتا جائے اور باقی اپنی جلد بازی اور نافہمی کی وجہ سے اصل جہت کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کریں اور ان میں سے کوئی شمال کو چلا جائے کوئی جنوب کو چلا جائے اور کوئی مشرق کو چلا جائے۔ پس اس میں شک نہیں کہ یہ سب اس شہر کی تلاش میں سرگرداں و کوشاں ہیں۔ لیکن یہ فرق ہو گیا ہے کہ ایک تو ان نشانات پر جو بتائے گئے تھے چلا جاتا ہے اور آخر منزل مقصود کو پہنچ بھی جائے گا۔ مگر باقی تین نے اپنی طرف سے کچھ ایسی باتیں ان نشانات میں ملا لیں کہ اصل راستہ سے بھٹک کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔ اور اگر اصل راستہ کی طرف نہ لوٹے تو ضرور ہے کہ اسی طرح چلتے چلتے مر جائیں گے اور منزل مقصود کو نہ پائیں گے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کو بھی اس شہر تک پہنچنے کی تڑپ ہے۔ اس طرح موجودہ مذاہب میں سے سچے مذہب کو چھوڑ کر (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) باقی سب مذاہب کے پیرو گو خدا تعالیٰ سے ملنے کی تڑپ رکھتے ہیں مگر وہ نشانات جو ان کو اس کے ملنے کے لئے بتائے گئے تھے (یعنی اس کی صفات) ان میں انہوں نے ایسی خود ساختہ باتیں ملا لی ہیں کہ اب وہ اصل راستہ سے بھٹک کر کہیں کے کہیں نکل گئے ہیں اور ان آلائشوں کی وجہ سے جن میں آلودہ ہو گئے ہیں زمین و آسمان کے خدا کو چھوڑ کر اپنے خیالات کے بموجب کچھ اور خدا تجویز کر کے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں اور ان کی مثال ان بکریوں کی ہے کہ جنہوں نے رات کے وقت اپنے مالک کے قدموں پر چلنا ترک کر دیا اور ادھر ادھر ہو گئیں اب چور ان کو بلاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے لگ جاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ وہ اس کا مالک ہے مگر صبح سے پہلے وہ ان کو قصاب کے سپرد کر دے گا اور آئندہ ان کو اپنا گھر دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔

چنانچہ اس دھوکے میں پڑ کر کسی نے تو محبت کے جوش میں برہما، وشنو، کرشن اور رام چندر

کے بھیس میں اسے دیکھا- اور کسی نے اس پاک ہستی کو ورا ' شیر ' مگرمچھ ' کچھ کی شکل میں اعتقاد کیا- کسی نے یسوع کے رنگ میں رنگین پایا- تو کسی نے بدھ کی صورت میں جلوہ گر (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ کُلِّ ذٰلِکَ) یہودیوں نے اگر موسیٰؑ کی معرفت اس کا دیدار چاہا تو زرتشتیوں نے زرتشت کی وساطت سے اس کی ملاقات کی خواہش کی مگر سچی بات یہی ہے کہ وہ وراء الوریٰ ہستی اس بات کی محتاج نہیں کچھ ' مگرمچھ یا کسی انسان کی صورت اختیار کرے اور یہ بات اس کی صفات کے بھی بر خلاف ہے- اس کا دیدار اس کی صفات کی معرفت سے ہوتا ہے چنانچہ اس سچے مسئلہ کو رسول اللہ ﷺ کی معرفت خدا تعالیٰ نے ہم تک پہنچایا اور فرمایا کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (الشوریٰ: ۱۲) کہ اس کی مانند کوئی چیز نہیں کہ جس کے بھیس میں وہ آسکے اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَ ھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَ ھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الانعام: ۱۰۴) یعنی یہ مادی آنکھیں اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتیں ہاں وہ ان آنکھوں کی کنہ کو خوب پہنچتا ہے اور وہ بڑا لطیف اور خبیر ہے-

پس ان سب بد عقائد کی جڑ صفات الٰہیہ سے بے خبری ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض نادان محبت کی وجہ سے بعض خدا نما لوگوں کو خدا ہی سمجھ بیٹھتے ہیں اور بعض مخلوقات الٰہیہ کو اس کا شریک قرار دیتے ہیں- اسی کی طرف قرآن شریف میں خدا تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (الحج: ۷۵) یعنی لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے پوری آگاہی حاصل نہیں کی اور نہ اس کی بڑائی کا پورا اندازہ کیا تحقیق اللہ قوی اور غالب ہے- کیا معنی کہ لوگ جو غفلت میں پڑ گئے ہیں اور ایسے معبودوں کی طرف جھک گئے ہیں جو خود ضعیف ہیں اور کوئی طاقت اور قوت نہیں رکھتے اور نقصوں سے پاک نہیں ہیں بلکہ طرح طرح کے نقائص سے آلودہ ہیں ایسے لوگوں نے صفات الٰہیہ کا پوری طرح سے مطالعہ ہی نہیں کیا- اور بلا سوچے سمجھے من گھڑت صفات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دی ہیں- کہ جن کی وجہ سے اصل معبود سے دور جا پڑے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسئلہ نجات میں بھی مختلف اقوام نے دھوکہ کھایا ہے-

اسلام کی تعلیم سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاک ذات جس کی محبت میں لاکھوں نہیں کروڑوں روحیں بے چین رہی ہیں اور ہیں اور رہیں گی تمام نقائص سے پاک ہے اور کسی قسم کی اس میں کمی نہیں ہے بلکہ تمام نیک صفات کی وہ جامع ہے اور بالکل بے عیب ہے اور کوئی اعلیٰ صفت نہیں کہ جس کا ہونا اس ذات کے لئے ضروری ہو اور وہ اس میں نہ پائی جاتی ہو اور نہ کوئی ایسی صفت ہے کہ جس کے ہونے سے اس میں نقص لازم آتا ہو... اور وہ اس میں پائی جاتی ہو-

اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات سے آگاہ کرنے کے لئے قرآن شریف میں مختلف جگہ پر صفات الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے تا ایسا نہ ہو کہ اس مذہب کے پیرؤوں کو کچھ مدت کے بعد خدا تعالیٰ کی صفات میں دھوکہ لگ جائے اور وہ سیدھے راستہ سے بھٹک جائیں اور نیکی کا طریق ان سے چھوٹ جائے اور ضلالت اور گمراہی کی وجہ سے یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف وہ صفات منسوب کریں کہ جو درحقیقت اس میں نہیں ہیں اور ان کا ہونا اس کے لئے عیب کا موجب ہو اور ایسی صفات جن کے نہ پائے جانے سے اس میں کمی لازم آتی ہو اور نقص وارد ہوتا ہو ان صفات کو اس سے جدا کردیں اور اس کے نتیجہ میں اس حقیقی خدا کا دامن چھوڑ کر مصنوعی خداؤں کے پیچھے لگ جائیں۔ پس قرآن شریف ہم کو بتاتا ہے کہ وہ خدا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ان میں طرح طرح کے جانور پیدا کئے اور انسان کو بنایا۔ اور بادلوں سے پانی اتارا۔ اور آگ اور ہوا سے انسان کے فوائد کی تکمیل کی وہ خدا بڑا طاقتور خدا ہے اور اس کے تمام فعل بالارادہ ہوتے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کام کو وہ کرنا چاہے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ اور جس کام کو وہ روکنا چاہے اسے کوئی کرنے والا نہیں۔

علاوہ اس کے قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے ہم کو یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کی خلقت میں ہی نیکی اور تقویٰ رکھا گیا ہے۔ جس سے وہ نیک بات اور بری بات میں فرق کرسکے۔ چنانچہ فرماتا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (الروم:۳۱) یعنی اللہ کی طرف سے دی ہوئی فطرت وہی ہے جو اس نے اپنے بندوں میں رکھی ہے اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں چاہئے۔ یہ ایک دین ہے جو استوار ہے لیکن اکثر لوگ ناواقف ہوتے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے انسان میں ایسی صفات رکھی گئی ہیں کہ جن سے وہ ایک حد تک صفات الٰہیہ کا مظہر بن سکتا ہے اور ایسی ایسی صفات حسنہ اس میں ودیعت کی گئی ہیں کہ جن کی مدد سے وہ نیک و بد کو پرکھ سکتا ہے اور اس طرح سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف کن صفات کو منسوب کرنا جائز اور کن کو منسوب کرنا ناجائز ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ انسان میں بھی ایک حد تک الٰہی صفات کا رنگ دیا گیا ہے اور اس لئے جب فطرت کے مطابق انسان الٰہی صفات کو پرکھتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں فلاں صفات کا اللہ تعالیٰ سے جدا کرنا اور فلاں فلاں صفات کا اس سے منسوب کرنا برا ہے۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان میں وہی صفات ہیں کہ جو میری طرف سے اسے میری معرفت حاصل کرنے کے لئے دی گئی ہیں اور چونکہ میری خلق میں

کوئی تبدیلی نہیں چاہئے-اس لئے ایسا نہ ہو کہ تم خلاف فطرت ایسی صفات تجویز کرو- جو میری خلق کے خلاف ہیں-اور میں نے ان کو پیدا کیا بلکہ ہمیشہ عقل و فطرت سے کام لیا کرو اور ان دونوں کو اپنا رہنما بناؤ-اور جب تک تم خود ان میں تبدیلی نہ کرو گے اس وقت تک تم راہ راست پر رہو گے- اس جگہ پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ عقل سے بالا کوئی علوم نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ فطرت و عقل کے مطابق کل علوم ہونے چاہئیں اس کے خلاف نہ ہوں مثلاً کوئی شخص ہم کو آکر بتائے کہ زید لاہور گیا ہے تو یہ بات ہماری عقل سے بالا ہے خلاف نہیں کیونکہ ہم کو سماع سے معلوم ہوئی ہے خود عقل بغیر کسی کی اطلاع کے اس بات کو دریافت نہ کر سکتی تھی- مگر جب معتبر خبر ہم کو ملی تو ہماری عقل نے کوئی وجہ اس کے رد کرنے کی نہیں پائی- پس جہاں جہاں میں عقل و فطرت کو انسان کا رہنما بتلاؤں گا میرا یہی مطلب ہو گا کہ جن باتوں کے وہ برخلاف نہ ہوں ان کو قبول کرو خواہ وہ کسی ذریعہ سے پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوں-

پس خدا تعالیٰ اس آیت میں ہم کو بتاتا ہے کہ فطرت انسانی تو ہماری ہی پیدا کی ہوئی ہے-اور اس میں ہم نے اپنے صفات کا پرتو ڈالا ہے پس اس میں تبدیلی مت کرو-اور اس کو اپنا رہنما بناؤ-اور جب تک تم اس اصول پر چلتے رہو گے اور اس راہ کو نہ چھوڑو گے تو تم سیدھی راہ پر رہو گے اور ہماری صفات کے سمجھنے میں دھوکہ نہ کھاؤ گے-چنانچہ فرماتا ہے ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ یعنی جو دین کہ اس طرح فطرت کے مطابق ہم کو چلاتا ہے اور وہ اصول ہم کو بتاتا ہے جو فطرت کے برخلاف نہ ہوں وہی سچا ہے اور باقی سب مذاہب جھوٹے ہیں اور غلطی پر ہیں اور انہوں نے خدا تعالیٰ کی حقیقت کو ہی نہیں سمجھا-اور وہ سیدھے راستہ سے دور جا پڑے ہیں اور کیونکہ ان کی بات بے ثبوت ہے اور ان کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس سے وہ اپنے دعوے کو ثابت کر سکیں اور یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کو اکثر لوگ نہیں جانتے-

پس قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک حد تک انسان کو اپنے صفات کا مظہر بناتا ہے اور جو طاقتیں کہ خدا تعالیٰ میں ہیں ایک حد تک انسان پر اس کا پرتو ڈالا ہے-چنانچہ اس کی تائید میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی صفات کا اپنے آپ کو مظہر بناؤ-اور وہ صفات حسنہ جو خدا تعالیٰ نے تم میں ودیعت کی ہیں ان کو ترک مت کرو-اور ان سے غافل مت ہو- بلکہ ان میں ترقی دو-اور اپنے آپ کو کامل مظہر بناؤ- چنانچہ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی

اور بھی تشریح کی ہے اور فرمایا ہے کہ جب مومن اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے بالکل سپرد کر دیتا ہے۔ تو اس وقت خدا تعالیٰ اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ پکڑتا ہے اور زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ اور پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ انسان ایسا اپنی فطرت پر پکا ہو جاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی بھی جائز نہیں رکھتا۔ اس لئے چونکہ انسانی فطرت میں الٰہی صفات رکھی گئی ہیں اور اس کی کل حرکات فطرت کے مطابق ہو جاتی ہیں تو اس وقت گویا اس کا ہر ایک فعل خدا کا ہی فعل ہو جاتا ہے اور ایسا انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔

پس اسلام نے سچے مذہب کی یہ نشانی بتائی ہے کہ وہ فطرت کے مطابق ہو اس کے برخلاف نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف ایسی صفات منسوب نہ کرتا ہو جو خلاف فطرت ہوں بلکہ ایسی صفات کو منسوب کرتا ہو جو عین فطرت کے مطابق ہوں۔ اور مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں ایسی صفات رکھی ہیں کہ جن سے انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف کونسی صفت منسوب کر سکتے ہیں اور کونسی نہیں۔

اس لئے مجھ کو کوئی بڑے دلائل دینے کی بھی ضرورت نہیں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر انسانی فطرت میں ایسی طاقت نہ ہوتی تو وہ خدا کی صفات کو سمجھ ہی نہ سکتا کیونکہ جو طاقت ایک چیز میں ہوتی ہی نہیں تو وہ اس قسم کا کام نہیں دے سکتی۔ مثلاً یہ کہ طوطے میں بولنے کی طاقت ہے جب ہم اس کو بولنا سکھاتے ہیں تو وہ بولنے لگتا ہے لیکن چونکہ بیل میں بولنے کی طاقت نہیں ہم لاکھ کوشش کریں وہ کبھی نہیں بول سکے گا کیونکہ اس میں وہ مادہ ہی نہیں رکھا گیا یا یہ کہ اونٹ کو پر نہیں دیئے گئے اور اس میں اڑنے کی طاقت نہیں رکھی گئی۔ اب لاکھ بھی ہم اس سے کہیں کہ تو اڑ اور وہ پرندوں کو اڑتا ہوا دیکھے لیکن نہ تو اس کی توجہ ہی اس طرف جا سکتی ہے اور نہ وہ اڑ ہی سکتا ہے اسی طرح کل جانور جن کو انسان کی طرح ترقی کی طاقت نہیں دی گئی اگر یہ ان کو سمجھانا چاہیں کہ دانا کے لئے ہر وقت ترقی کی فکر میں لگا رہنا ضروری ہوتا ہے اور ایجادوں سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا اس کا فرض ہوتا ہے تو وہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے کیونکہ ان میں یہ طاقت ہی نہیں رکھی گئی۔ انسان کو دیکھو کہ کہاں سے کہاں ترقی کر کے آ گیا ہے مگر جانور جس طرح آج سے دو ہزار یا تین ہزار یا چار ہزار سال پہلے تھا۔ اسی طرح آج کل بھی ہے یعنی جس طرح مکھی آج سے ہزاروں سال پہلے شہد تیار کیا کرتی تھی۔ اسی طرح اب بھی کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ انسان کی طرح نئی نئی ایجادیں کرتی

رہے۔ مگر آج سے دو ہزار سال پہلے اگر انسان رتھوں پر سوار ہوتا تھا اور اس کے بعد جنڈول اور پینس اور سکھ پال وغیرہ سواریاں نکل آئیں پھر اور ترقی کی تو گھوڑے گاڑیاں ایجاد ہوئیں اور پھر ان میں مختلف قسم کی کتر بیونت ہوتی رہی اور وہاں سے انسان نے ترقی کی تو ریل ایجاد کی اور پہلے اگر دس میل فی گھنٹہ رفتار تھی تو پھر پندرہ میل اور رفتہ رفتہ ایک سو دس میل تک لے آیا اور سٹیم سے ترقی کی تو برقی طاقت سے کام لینے لگا اور اس سے بھی بڑھا تو ہوائی جہاز ایجاد کئے۔ مگر مکھی نے شہد کے بنانے کے طریقہ میں اور ریشم کے کیڑے نے کپڑے کے بنانے میں اس عرصہ میں نئی نئی ایجادیں نہیں کیں جس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں یہ طاقت ہی نہیں رکھی گئی۔ اب اگر ہم کسی جانور کو فلسفہ کے مسائل سمجھانے بیٹھیں تو کیا سمجھا سکتے ہیں؟ کبھی نہیں کیونکہ اسمیں وہ مادہ ہی نہیں۔

پس جب تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ جو طاقت کسی چیز میں نہ ہو وہ اس سے کام نہیں لے سکتی تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ اگر انسان میں ان صفات کا پرتو نہ ڈالا گیا ہو جو خدا تعالیٰ میں ہیں تو پھر بھی وہ اس کی صفات کو سمجھ سکے۔ خدا تعالیٰ کو ملنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ اس کی صفات کا کامل علم ہے پس جب انسان ان صفات کا علم ہی نہیں حاصل کر سکے گا تو وہ ان کا عرفان کیونکر حاصل کرے گا۔ پس الٰہی گیان یا عرفان کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان میں الٰہی صفات کا جلوہ موجود ہو اور یہی مطلب ہے ان آیات و احادیث کا جو میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ انسان میں الٰہی صفات کا پرتو ایک حد تک ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی فطرت اس طرح نیک بنائی گئی ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو وہ ضرور خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھ سکتا ہے۔ پس معلوم ہؤا کہ الٰہی صفات کے سمجھنے کا ایک ہی طریق ہے کہ انسان فطرت انسانی کو دیکھے اور پھر ہر ایک مذہب کی بتائی ہوئی صفات کو اس کسوٹی پر پرکھے۔ تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ کونسا مذہب سچا ہے اور فطرت کے مطابق ہے اور کونسا جھوٹا اور فطرت کے برخلاف۔ پس اب میں اسلام کا دعویٰ مشاہدات کے دلائل سے ثابت کر آیا ہوں کہ انسان میں الٰہی صفات کا ضرور ایک حد تک جلوہ ہونا چاہئے تاکہ انسان الٰہی صفات کو سمجھنے کے لائق ہو اور اگر اس میں وہ صفات نہ رکھے جاتے تو وہ ایک جانور کی طرح جو فلسفہ کے مسائل ہزار برس پڑھانے پر بھی نہیں پڑھ سکتا۔ الٰہی صفات کے سمجھنے کے ناقابل ہوتا۔

پس اب مذاہب کے دعاوی کے پرکھنے کے لئے ہمارے لئے ایک بہت آسان راہ نکل آئی کہ اگر کسی مذہب کا دعویٰ عقل انسانی اور فطرت کے برخلاف ہو اور متعارض ہو تو وہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ جب ہماری فطرتیں الٰہی صفات کا جلوہ گاہ ہیں تو جو بات ہماری فطرتوں کے برخلاف اور

صریح متعارض ہے ضروری ہے کہ وہ الٰہی صفات کے بھی برخلاف اور متعارض ہو۔ اس لئے اگر کوئی مذہب خدا تعالیٰ کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب کرے کہ جو ہماری فطرتوں کے برخلاف اور متعارض ہے تو ہم فوراً سمجھ لیں گے کہ یہ صفت خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بالکل ناجائز اور منع ہے۔

اب جبکہ یہ طے ہو گیا کہ کل مذاہب کی بتائی ہوئی الٰہی صفات کو مدنظر رکھ کر ہم دیکھیں گے کہ انسانی خلقت کس طرح واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فطرت میں ایسی صفات ہیں کہ جن کو وہ فطرتاً نیک کہتا ہے اور بعض ایسے فعل ان سے سرزد ہوتے ہیں کہ ان کو وہ فطرتاً برا کہتا ہے چنانچہ پھر تجربہ اور مشاہدہ اس پر گواہی دیتا ہے کہ واقعی یہ فعل نیک ثمرات کا لانے والا اور یہ فعل برے نتائج کا پیدا کرنے والا ہے مثلاً جب ایک انسان دوسرے سے محبت اور اخلاص سے پیش آتا ہے اور کشادہ پیشانی سے ملاقات کرتا ہے تو دوسرے کے دل میں فطرتاً اس کی محبت پیدا ہوتی ہے اور اس کی بہتری کا خیال اس کے دل میں جاگزین ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر برخلاف اس کے کوئی شخص دوسرے سے کج خلقی سے پیش آتا ہے اور اخلاق حمیدہ کو ترک کر دیتا ہے اور انسانیت کو چھوڑ کر درندگی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے تو لوگ اس سے کنارہ کرتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی صحبت کو ترک کر دیتے ہیں اور اس سے جدائی اختیار کر لیتے اور اس کی عزت ان کے دلوں سے اٹھ جاتی ہے اور اس کی بجائے نفرت گھر کر لیتی ہے اور تمام علاقہ میں اس کی شکایات کی آواز بلند ہو جاتی ہے اور وہ لوگوں میں انگشت نما ہو جاتا ہے۔

پس غور کرو کہ اس با اخلاق انسان کی محبت اور اس کج اخلاق کی نفرت کی کیا وجہ ہے اور کیوں اس کے ساتھ لوگوں نے تعلقات کو بڑھایا اور اس سے علیحدگی اختیار کی اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ اس نے تو فطرت انسانی کے جذبات کو ملحوظ رکھا۔ اور اس نے فطرت کو بدل دیا۔

پھر اسی طرح ایک شخص جو بڑا سچا ہے اور سچ کی وجہ سے خواہ اس کا نقصان بھی ہو جائے۔ وہ اسے ترک نہیں کرتا اور جھوٹ کے قریب نہیں جاتا۔ اس کی بات پر تمام لوگ اعتبار کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کا انکار نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی شہادتوں کی تصدیق کی جاتی ہے اور اس کو جھٹلانے والا خود جھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے برخلاف وہ شخص جو اپنی فطرت کو بدلتا ہے اور جھوٹ کی نجاست کو استعمال کرتا ہے اور سچ کے بولنے کے پاک طریق کو چھوڑ دیتا ہے اس کا اعتبار اٹھ جاتا ہے اور غیر تو غیر خود اس کے یار و غمگسار تک اس کی باتوں کو خلاف واقعہ سمجھتے ہیں۔ اور

اس کی بات کا انکار کرنا برا نہیں بلکہ دور اندیشی سمجھا جاتا ہے اور اس کی بدنامی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح تمام نیک صفات کا نتیجہ نیک نکلتا ہے اور بد افعال کا نتیجہ بد اور یہ ایک ایسا آلہ اور ایسی کسوٹی ہے کہ جس پر انسان اپنی صفات کو پرکھ سکتا ہے اور اس طرح اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ صفات جو فطرتاً نیک معلوم ہوتی ہیں وہ ہیں بھی نیک اور یہ کہ جو صفات فطرتاً بد معلوم ہوتی ہیں اس کے نتائج بھی بد نکلتے ہیں۔ پس فطرت کے پرکھنے کے لئے ایک تجربہ بھی انسان کو دیا گیا ہے کہ جس سے انسان اپنی فطرت کو پرکھتا رہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ضمیر ہے کہ جو اس کی مددگار بنی ہوئی ہے اور اس کو آگاہ کرتی رہتی ہے کہ اس کا کونسا کام فطرت کے مطابق ہے اور کون سا برخلاف فطرت۔ پس جب انسان فطرت سے کام لیتا ہے تو اسے کوئی ملامت نہیں ہوتی اور جب وہ فطرت کے برخلاف کام کرتا ہے تو فوراً اس کو ملامت شروع ہو جاتی ہے۔ اور گو کہ ایک مدت تک فطرت کے برخلاف کام کرنے سے دل پر ایک زنگ لگ جاتا ہے اور فطرت انسانی مسخ ہو جاتی ہے اور اس آئینہ کی طرح ہو جاتی ہے کہ جو زنگ کی کثرت کی وجہ سے عکس قبول نہیں کرتا اور اپنی اصلی حالت کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر پھر بھی ایسے انسان کسی نہ کسی وقت فطرت کے مطابق بول ہی اٹھتے ہیں ایک چور اپنے گروہ میں چوری کو برا سمجھتا ہے ایک ٹھگ اپنے گروہ میں ٹھگی کو مکروہ خیال کرتا ہے۔ کنجر تک اپنی بہو سے پیشہ نہیں کرواتے۔

پس معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کہیں نہ کہیں سے اپنا راستہ تلاش کر ہی لیتی ہے۔ علاوہ ازیں اکثر بدیوں میں ایک حد تک اخفاء کا خیال رہتا ہے جس سے انسان کو اس کی فطرت پر آگاہی ہوتی رہتی ہے۔ غرضیکہ فطرت انسانی کو جب ہم دیکھتے ہیں تو بعض صفات کو وہ نیک خیال کرتی ہے اور بعض کو مکروہ۔ پس اس فطرت سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کونسی صفت خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنی نیک ہے اور کونسی بری۔ جو صفات کہ انسان کے قدس پر دلالت کرتی ہیں۔ اور وہ اس کے نقائص کو دور کرنے کے لئے نہیں ہیں وہ تو خدا تعالیٰ کی طرف انسان منسوب کرتا ہے۔ اور جو صفات کہ بری ہوں یا نقائص پر دلالت کرتی ہوں تو وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی جاتیں۔ پس اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان میں رحم کا مادہ ہے اور یہ ایک نیک صفت یقین کی گئی ہے اور اس کے برخلاف جس انسان نے رحم کے برخلاف کام کیا ہو وہ خود لوگوں کی نظر میں گر جاتا ہے۔ فطرت انسانی کو مشاہدہ کر کے دیکھ لو کہ یہ شروع سے ہی رحم کی محتاج چلی آئی ہے۔ چنانچہ اگر والدین کی طبیعت میں رحم کا مادہ نہ ہو تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ بچہ بڑھ سکے۔ بچہ تو پیدا ہوتے ہی ہلاک ہو جائے گا اور ایک دن بھی

زندہ نہ رہ سکے گا- پس جبکہ والدین جو صرف بچہ سے ایک عارضی تعلق رکھتے ہیں اور اس کے اس دنیا میں لانے کے وسیلہ ہی ٹھہرے ہیں اور اس کے پیدا کرنے میں خود ان کی کوششیں کوئی دخل نہیں رکھتیں اس ذرا سے تعلق کی وجہ سے اپنے بچہ پر اس قدر رحم کرنے لگتے ہیں جو محبت بلکہ عشق کے نام سے موسوم ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ جو کہ اصل خالق اور مالک ہے کیا رحم نہ کرے گا؟ غرض کہ انسان بچپن سے ہی رحم کا محتاج ہے- والدین جب تک اس پر رحم نہ کریں وہ ایک دم بھی گزارہ نہیں کر سکتا- پھر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں تو بچوں کے بہت سے قصوروں پر نظر اندازی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ بے علم بچہ ہے اس کو کیا سزا دینی ہے- چنانچہ بچوں کو سزا دینے والے سخت بے رحم اور ظالم تصور کئے جاتے ہیں اور اپنے بچے تو الگ رہے دوسرے کے بچوں کو سزا ملتے ہوئے دیکھ کر بھی انسانی فطرت جوش میں آجاتی ہے اور فوراً سفارشیں شروع ہو جاتی ہیں کہ یہ بے علم معصوم بچہ ہے اس کو سزا کیوں دیتے ہو- اور یہ سب اس لئے کہ وہ ناقص ہے اور اس کا علم اپنے کمال کو نہیں پہنچا- اسی طرح جب انسان بڑا ہوتا ہے تو پھر اس وقت یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جوان آدمی ہے- نادانی کی وجہ سے جوش جوانی میں ایسا کام کر بیٹھا- اور اس کے لئے بھی ایک راہ رحم کرنے کی نکال لی جاتی ہے اور جب وہ ذرا بوڑھا ہوا تو پھر کہا جاتا ہے ضعیف آدمی ہے سزا کے قابل نہیں معافی بہتر ہے- غرض کہ فطرت انسانی ہر وقت رحم کی ملتجی رہتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں رحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور وہ ہر وقت اپنے اوپر رحم چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے بھی رحم کی درخواست کرتا ہے مثلاً جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اور ان کے قصوروں اور خطاؤں کو نہیں بخشتا وہ اپنے ہم چشموں کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے اور اچھا کہلاتا ہے- اور یہ صفت انسانوں میں ہی نہیں بلکہ حیوانوں میں بھی بعض دفعہ نظر آتی ہے- غرضیکہ احسان و مغفرت انسانی سرشت میں ہے اور بنی نوع انسان روز ایک دوسرے کے گناہوں پر چشم پوشی کرتے رہتے ہیں ہاں اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ مرحمت یعنی مغفرت کرنے سے اور مجرم پر رحم کرنے سے برائی اور بڑھ جاتی ہے تو یاد رہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عالم الغیب تو ہے ہی نہیں بعض دفعہ اپنے فیصلہ میں غلطی کرتا ہے اور جہاں عقوبت مناسب ہوتی ہے وہاں رحم کر بیٹھتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی برا پیدا ہوتا ہے اس صفت رحم پر کچھ اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو اس کو برخلاف فطرت استعمال کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے- جیسے کہ ایک دوائی جو خواہ کیسی ہی مفید ہو اور کیسی ہی قیمتی اور لاثانی ہو اگر کسی ایسے مریض کو دی جائے کہ جس کے لئے وہ

مضر ہے تو ضرور نقصان کرے گی۔ لیکن اس سے اس دوائی پر کوئی اعتراض نہیں پڑے گا کہ یہ خراب ہے مثلاً کونین ایک بڑی مقدار میں ایک حاملہ عورت کو دے دی جائے تو وہ اسے نقصان کرتی ہے گو اس سے کونین پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو تشخیص کرنے والے کی غلطی ہے کہ اس نے مریض کی حالت کو نہ دیکھا۔ پس اگر رحم کو بے موقعہ استعمال کرنے پر اس کا کوئی برا نتیجہ نکلے تو یہ تشخیص کا نقص ہے نہ کہ رحم کا کیونکہ رحم تو بہرحال ایک عمدہ صفت ہے ہاں جب اسے غیر محل استعمال کیا جائے گا تو ضرور اس سے نقصان ہوگا۔ پس اس قسم کے نقصانوں سے خود رحم پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ اور وہ بہرحال ایک عمدہ صفت ہے۔ غرضکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رحم انسانی سرشت میں ازل سے پڑا ہوا ہے۔ اور رحم نہ کرنے والا اگر ظالم نہیں تو بخیل ضرور خیال کیا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے ہر ایک روحانی بات کا ایک پہلو اس دنیا میں دکھایا ہے تاکہ انسان اس کو دیکھ کر سمجھ سکے کہ اسی طرح وہ معاملہ بھی ہوگا۔ اسی کے مطابق اپنے کاموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رحم کی صفت پر جب تک عمل نہ کیا جاوے تو ہمارے اخلاق اپنا کمال حاصل نہیں کرتے چنانچہ عدل خود بھی ایک عمدہ صفت رحم کے ماتحت ہے یعنی جبکہ ہم کسی کو اس کا پورا بدلہ دیں تو وہ عدل کہلاتا ہے اور جب ہم اسے زیادہ دیں تو وہ احسان یا رحم کہلاتا ہے جیسے کہ ایک مزدور جو سارا دن کام کرتا رہا اور شام کو اسے آٹھ آنے مزدوری ملنی ہے اگر ہم اسے ایک روپیہ دیدیں تو یہ ہمارا رحم ہے اور احسان ہے اور اس فعل سے ہماری دنیا میں بدنامی نہیں ہوگی بلکہ شہرت ہوگی اور ہماری نیکی کی لوگ تعریف کریں گے یا ایک قرضدار جس نے ہمارا کچھ روپیہ دینا ہے اگر ہم اس سے پورا روپیہ وصول کریں تو یہ ہمارا عدل ہوگا اور کوئی ہم پر اعتراض نہ کرے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن اگر ہم اس کو روپیہ بخش دیں یا کم استطاعتی پر خیال کر کے اس کو اور ڈھیل دیدیں تو یہ ہمارا رحم ہوگا۔ اور اس پر ہم بدنام نہیں نیک نام ہوں گے اور خود اس شخص کے دل میں جو ہمارا مقروض ہے ہماری عزت اور محبت بڑھ جائے گی۔

جیسا کہ قرآن شریف نے بھی اس مسئلہ کو خوب وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الشوریٰ:۴۱) یعنی اس بات کی خدا تعالیٰ اجازت دیتا ہے کہ جس نے جس قدر بدی تم سے کی ہے اسی قدر اس کو سزا دے لو۔ لیکن اگر کوئی اصلاح سمجھ کر معاف کر دے تو وہ عنداللہ مأجور ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کی

درگاہ میں انعام کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ خدا تعالیٰ ظالمین کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی نہ ان کو جنہوں نے ظلم کیا اور نہ ان کو جنہوں نے اصلاح، عفو میں دیکھ کر پھر بھی سزا دی اور نہ ان کو جنہوں نے بے حیائی سے کام لیا اور عفو سے دنیا میں اور بھی فساد پیدا کیا۔ پس اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عفو اور رحم عدل سے زیادہ عمدہ صفتیں ہیں اور اس سے اعلیٰ درجہ پر ہیں اور خود تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ جب ہم عدل کرتے ہیں تو اس کے لئے ہم ایسے مشکور نہیں ہوتے جیسا کہ رحم کے وقت۔ مثلاً ایک مزدور کو اس کی پوری مزدوری دے کر ہم شکریہ کے مستحق نہیں ہوتے ہاں جب ہم اس کو کچھ انعام بھی دے دیں تو اس وقت وہ دل سے ہمارا شکریہ ادا کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کی نظروں میں بھی ہم قابل تحسین ٹھہرتے ہیں یا جبکہ ایک شخص ہم کو گالیاں دیتا ہے یا مارتا ہے تو اگر ہم اس وقت عفو میں اصلاح دیکھ کر اس کو معاف کر دیں جس سے آئندہ اس کو نصیحت ہو جائے تو یہ ہمارا عیب نہیں سمجھا جائے گا۔ بلکہ ایک خوبی ہوگی اور لوگ بجائے اس کے کہ ہم کو ظالم کہیں کہ ہم نے عدل نہیں کیا کہ مزدور کو بجائے آٹھ آنے کے روپیہ دے دیا اور قرض خواہ کو معاف کر دیا اور ہم کو تکلیف دینے والے کو بغیر تکلیف کے چھوڑ دیا بلکہ لوگ ہماری تعریف کریں گے اور ہم کو رحم دل قرار دیں گے۔ اور بجائے نقص کے یہ فعل ہماری خوبی سمجھی جائے گی۔ غرضیکہ انسان میں رحم کا مادہ ہے۔ اور عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور عدل سے بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔ اور حسب موقعہ رحم نہ کرنے والا ظالم تصور کیا جاتا ہے پس جبکہ اس خوبی کو اپنے اندر دیکھتے اور روز مشاہدہ کرتے ہیں تو پھر ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس خوبی سے محروم ہے اور اس کی صفات میں رحم کا کوئی مادہ نہیں۔ پس انسانی مشاہدہ ہم کو بتاتا ہے اور روز روشن کی طرح کھول دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ میں رحم کی صفت ضرور ہے ورنہ وہ ناقص ہوگا اور ناقص ذات اپنے اندر آپ قائم نہیں رہ سکتی اور اس طرح خدا تعالیٰ کے وجود سے ہی انکار کرنا پڑے گا۔ اور دہریت کی طرف رجوع کرنا ہوگا یا کم سے کم یہ ماننا پڑے گا کہ جو نیک صفات ہم میں ہیں وہ خدا تعالیٰ میں نہیں اور بعض نیکیاں ایسی بھی ہیں کہ جن میں ہم خدا تعالیٰ سے بڑھ گئے ہیں۔ اور یہ ایک سخت کفر اور شرک کا کلمہ ہے کہ جو ایک نیک آدمی کبھی بھی اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔ غرض کہ اب میں ثابت کر چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے اپنی ذات کے سمجھانے کے لئے ہم میں اپنی صفات کا ایک پرتو رکھا ہے جس سے کہ ہم نیکی اور بدی کو پہچان سکتے ہیں۔ اور اندازہ کر سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف کونسی صفت کا منسوب کرنا خلاف شان ہے۔ اور کونسی صفت کا اس سے الگ کرنا اس کے نقص پر دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے میں نے

اس کا ثبوت دیا ہے اور پھر میں نے بتایا ہے کہ رحم کی صفت انسان میں ہے اور وہ عدل سے بڑھ کر سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ نہ ہوتی تو دنیا کا کارخانہ ہی الٹ جاتا۔ اور پھر قرآن شریف سے میں نے اس مسئلہ کو بھی نکال کر بتایا ہے کہ اسلام بھی اسی کا قائل ہے چنانچہ جب یہ ثابت ہو چکا۔ تو معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ میں بھی رحم کا مادہ ہے اور وہ چونکہ عدل سے بالا ہے اور اعلیٰ مرتبہ ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے اپنی گوناگوں حکمتوں سے کام لے کر اس صفت کو بھی استعمال کیا ہے۔ اور میرا اس مسئلہ کو یہاں لکھنا اس باعث سے ہے کہ اس مسئلہ کے حل ہونے سے نجات کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب نے عدل اور رحم میں فرق محسوس نہ کرنے میں نجات کے معاملہ میں غلطی کھائی ہے اور اگر وہ خدا تعالیٰ کی ان صفات میں دھوکہ نہ کھاتے تو کبھی بھی نجات کے معاملہ میں ان کو غلطی نہ ہوتی۔

اب میں اسلام کی نجات کو بتاتا ہوں کہ وہ کس طرح انسانی نجات کو قوانین فطرت کے مطابق قرار دیتی ہے۔ سو یاد رہے کہ خدا تعالیٰ ہم کو بتاتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں۔ میں رحیم ہوں۔ اگر تم گنہگار ہو اور جہل اور کم علمی سے یا معرفت کی کمی سے تمہارے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔ اور تمہاری عمر کو گناہوں کے کیڑے نے گھن لگا دیا۔ اور تم ایک عرصہ تک اپنی ماں کی چھاتیوں سے جدا رہے ہو اور مصنوعی پستانوں کو جو دانتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور بھوک ان سے دور نہیں ہوتی چوستے رہے ہو۔ اور ان دشوار گذار راہوں میں پڑے رہے ہو جو انسان کو صراط مستقیم سے دور پھینک دیتی ہیں اور اس بچھڑے کی طرح جو اپنی ماں کو بھول کر ایک مصنوعی گائے کے پیچھے لگ جائے کہ جس کے اندر سوائے بھس کے اور کچھ نہیں میری پرستش کو چھوڑ کر ہوا و ہوس کے غلام بنے رہے۔ تو آؤ میں تمہارے گناہ بخش دوں گا۔ اور جیسے ماں اپنے بچھڑے ہوئے بچہ کو جو ایک مدت تک آوارہ رہا ہو اور پھر اپنی آوارگی پر پشیمان ہو کر اپنی ماں کے گھر میں رہنے کے لئے آیا ہو اپنے کلیجہ سے لگا لیتی ہے ویسے میں تمہاری کل خطاؤں کو بھلا دوں گا۔ اور نئے سرے سے تم سے عہد باندھوں گا اور تمہاری کل کمزوریوں کو نظرانداز کر دوں گا اور تمہارے گناہوں کو میٹ دوں گا۔ اور تمہاری بدیوں کو پوشیدہ کر دوں گا۔ اور تمہیں وہ کچھ دوں گا کہ جس کا گمان تک بھی تمہیں نہ ہو۔

چنانچہ فرماتا ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ

مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (الزمر: ۵۴۔ ۵۵) یعنی اے میرے بندو! کہ جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اور گناہوں میں ڈوب گئے اور خطاؤں میں غرق ہو گئے۔ اور ہر وقت ظلم و تعدی میں لگے رہے ہو اور جنہوں نے خدا کی راہ بھلا کر اور راہ اختیار کرلی ہے اور اس مہربان اور سچے محبوبؐ کو چھوڑ کر اور اشیاء سے دل لگایا ہے اور حقیقت کی بجائے جھوٹ کو پسند کیا ہے اور خالق کی جگہ مخلوق کو چن لیا ہے۔ اور نیکی کو ترک کرکے بدی کو لے لیا ہے۔ ناامید مت ہو اور میری درگاہ سے مایوسی مت کرو۔ کیونکہ میں تو سب گناہوں کو معاف کر دیا کرتا ہوں اور ہر ایک قسم کی خطاؤں سے درگذر کرتا ہوں اور بڑا مہربان ہوں تم گھبراتے کیوں ہو اور مایوس کیوں ہوتے ہو جس وقت تم کو سمجھ آئے۔ اور تم معلوم کرلو کہ اصل سچی راہ کونسی ہے اور سلامتی کس طریق میں ہے اور ہدایت کا راستہ کونسا ہے اور نیکی اور تقویٰ کیا ہے اور بدی میں کون کون سے نقائص ہیں اور گناہوں سے کیا نقصان ہے اور تمہارے دل نیکی کی طرف جھک جائیں اور تم کو سچائی کی لو لگ جائے اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے تم بے چین ہو جاؤ تو اس وقت میری طرف جھکو۔ اور اپنے گناہوں کا خیال مت کرو اور مضٰی ما مضٰی سمجھ کر اپنی پچھلی زندگی کو بھلا دو۔ اور آئندہ کے لئے بہتری کا ارادہ کرلو اور یاد رکھو کہ میں تمہارا رب ہوں جس نے تمہاری جسمانی کمزوریوں کے لئے اور بیماریوں کے لئے ہر ایک قسم کی دوا تجویز کی ہے۔ اور تمہاری جسمانی ضروریات کے لئے سامان مہیا کئے ہیں اور والدین کی محبت بھری گود سے تمہاری مدد کی ہے پس جب کہ میں ایسا رب ہوں تو اپنی روحانی مصیبتوں کے وقت بھی گھبراؤ مت اور بلا کھٹکے توبہ کرو۔ اور میری طرف جھک جاؤ اور آئندہ میری فرمانبرداری کا اقرار کرلو اور ارادہ کرلو تاکہ تم اس عذاب سے بچ جاؤ جو کہ جب آتا ہے تو پھر کسی کی مدد نہیں کی جاتی۔

پس کیسی پاک ہے یہ تعلیم اور کیسا پیارا ہے یہ کلام جو اسلام نے نجات کے بارے میں بیان فرمایا ہے جو نہ صرف کل اعتراضوں اور کمزوریوں سے ہی مبرّا ہے بلکہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور ہمارے روزمرہ کے مشاہدات کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ والدین کو الگ کرکے جب کہ ہمارے دوست و آشنا عزیز و اقرباء اور ہمسائے اور واقف اور ملاقاتی تک بھی ہم پر رحم کرتے ہیں اور ہماری کمزوریوں پر چشم پوشی کرتے ہیں اور اگر ہمارے قصوروں کو یاد رکھیں اور حافظہ سے گرا نہ دیں تو کینہ توز اور کمینہ کہلاتے ہیں تو پھر وہ خدا جو ہمیں وجود میں لایا اور ہمارے لئے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ہر قسم کی نعمتوں سے ہمیں بہرہ مند کیا اور کرم اور فضل سے ہمارا گھر بھر دیا۔ اور

ہر قسم کے سامان ہمارے لئے مہیا کئے اور ذرہ ذرہ چیز کا خیال رکھا اور کوئی چیز نہ رہی کہ جس کی ہم کو ضرورت ہو اور اس نے اسے پیدا نہ کیا ہو اور کوئی سامان نہ رہا جو ہمارے لئے آرام کا موجب ہو اور اس نے اسے نظر انداز کر دیا ہو جس نے ہماری پرورش کے لئے والدہ کی چھاتیوں میں سے دودھ نکالا اور ہم کو نامعلوم ذریعوں سے اس کے پینے کا علم سکھلایا۔ جب کہ کوئی شئے ہم کو کچھ نہ سکھلاتی تھی اور جس نے چرند پرند اور درند پر ہم کو حکومت بخشی اور چاند اور سورج کو ہمارے لئے مسخر کیا اور عناصر کو ہمارے تابع فرمان بنایا۔ کیا ہمارے گناہوں پر چشم پوشی نہ کرے گا اور ہماری خطاؤں سے درگذر نہ کرے گا؟ اور جبکہ ہم اس کے پاس اپنی کمزوریوں سے واقف ہو کر مدد کے لئے جائیں۔ اور ہمدردی کے لئے چلّائیں اور ہمارے سینے فرطِ غم سے پھٹ جائیں اور دوزخ کا نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور کرب واندوہ سے ایک دیوانگی طاری ہو جائے تو کیا وہ مہربان اپنی محبت کے دامن کو ہم سے الگ رکھے گا اور ہم پر نہیں ڈالے گا۔ اور کیا ایسے وقت میں اپنی الفت کی چادر میں ہم کو نہیں لپٹائے گا۔ اس کی مہربانیاں اور بندہ پروریاں ظاہر کرتی ہیں اور فطرت انسانی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ رحیم کریم ہستی وہ مہربان ذات جو ماں باپ سے زیادہ مہربان اور عزیز واقرباء سے زیادہ محبت کرنے والی اور بھائی بندوں سے زیادہ الفت رکھنے والی اور بیوی بچوں سے زیادہ پیار کرنے والی ہے ضرور ضرور اور ضرور ہماری توبہ کو قبول کرے گی اور ہمیں ہلاکت کے گڑھے سے نکال لے گی کیونکہ جب کہ ہم اپنے پیاروں کی توبہ قبول کرتے اور اجنبیوں پر رحم کرتے ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ مہربان خدا ہم پر رحم نہ کرے گا۔ یہ خیال اس کی نسبت دل میں لانا بھی کفر ہے اور وہ بڑا پاک ہے اور بڑا مہربان ہے۔

وہ ہم کو اپنے پاک کلام میں بتاتا ہے کہ ہرگز ناامید مت ہو اور مایوسی میں نہ پڑو۔ بلکہ جب تم اپنے گناہوں پر آگاہ ہو جاؤ اور نیکی کی قدر کو پہچان لو تو فوراً توبہ کرو اور یہ خیال مت کرو کہ اب کیا ہوگا۔ اب تو تم بہت سے گناہ کر چکے ہو اور جہنمی ہو چکے ہو بلکہ ہر وقت میری رحمت کے امیدوار رہو کہ میں ماں باپ سے زیادہ مہربان ہوں اور بیوی بچوں سے زیادہ خیر خواہ۔ اور ایک جگہ ہی نہیں بلکہ بیسیوں جگہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے اس مضمون میں کہا ہے کہ میں بخشنہار ہوں اور خطاؤں کو معاف کرتا ہوں اسی لئے ناامید ہونے والے کو کافر کہا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف:۸۸) یعنی اے لوگو! تم خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ناامید مت ہو کیونکہ اس کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں کہ جو

کافر ہوتے ہیں یعنی جن کو اس کے لطف اور کرم پر بھروسہ نہیں ہوتا- اور جو اس کی مہربانیوں کو جو کہ پیدائش کے دن سے اس دن تک ان پر ہوئی ہوتی ہیں بھلا چکے ہوتے ہیں کیونکہ اگر وہ ایماندار ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر نہ کر چکے ہوتے تو کبھی بھی یہ گمان نہ کرتے کہ خدا تعالیٰ آڑے وقت میں ان کے کام نہ آئے گا اور توبہ قبول نہ کرے گا پھر اور بہت سی جگہوں میں بار بار فرماتا ہے کہ توبہ کرو توبہ قبول ہو گی چنانچہ فرماتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحاً عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَ یُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (التحریم:۹) یعنی اے لوگو جن کو مجھ پر ایمان آگیا ہے میری طرف توبہ کرو اور ایسی توبہ کہ جو خالص ہو تو قریب ہے کہ میں جو تمہارا رب ہوں- تمہاری بدیوں اور گناہوں اور خطاؤں اور کمزوریوں اور نقصوں کو دور کر دوں اور پردہ ڈالدوں اور اس کے بعد تم کو وہ مدارج عنایت کروں کہ تم دین و دنیا میں بڑے ہو جاؤ- اور میرے انعامات و اکرامات کے مستحق بن جاؤ اور ملکوں کا بادشاہ تم کو بنا دیا جائے- پس اس جگہ خدا تعالیٰ نے اپنے گنہگار بندوں کو دلیری دی ہے اور کہا ہے اگر تمہارے دل ایمان کی طرف جھک گئے اور تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو آؤ توبہ کرو تا کہ تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں اور انعامات الٰہیہ کے تم وارث ہو جاؤ اور پھر فرماتا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (التوبہ:۱۰۴) یعنی کیا لوگ نہیں جانتے کہ اللہ ہی تو ہے جو کہ توبہ کو قبول کرتا ہے اپنے بندوں سے اور صدقات لیتا ہے اور یہ کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ اصل میں تو خدا تعالیٰ ہی توبہ قبول کرتا ہے اور کوئی نہیں جو کہ توبہ قبول کرے جس کا یہ مطلب ہے کہ اول تو لوگ خدا تعالیٰ جیسے مہربان اور عنایت فرما ہو نہیں سکتے دوسرے جو لوگ مہربانی کرتے ہیں وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو کام میں لاتے ہیں اس لئے اصل توبہ اللہ ہی قبول کرتا ہے پس خدا تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسانوں نے توبہ کیا قبول کرنی ہے اصل توبہ تو میں قبول کرتا ہوں کیونکہ میں سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہوں پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ (المؤمن:۴) یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ سزا دے نہیں سکتا بلکہ وہ شدید العقاب ہے- ہاں یہ مہربانی اس لئے ہے کہ وہ ذی الطول یعنی انعام کرنے والا ہے- اس کے سوا کوئی معبود نہیں- اور اسی کی طرف پھر جانا ہے- غرض کہ اب میں ثابت کر چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ میں کل نیک صفات

پائی جاتی ہیں اور جو کوئی کسی نیک صفت کو اس سے الگ کرتا ہے گویا کہ وہ اس میں نقص مانتا ہے اور اس طرح ناقص قرار دے کر اس کے قائم بالذات ہونے سے بھی منکر ہے اور میں نے بتایا ہے کہ انسانی خلقت میں بھی رحم بھرا ہؤا ہے اور یہ کہ عدل رحم سے نچلے درجہ کی ایک صفت ہے اور خدا تعالیٰ جو تمام محاسن کا جامع ہے رحم سے کبھی بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ بڑا رحیم کریم ہے اور جب کوئی شخص اپنے گناہوں سے سچے دل سے پچھتائے اور خدا کے حضور میں توبہ کرے تو چونکہ وہ ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے اس لئے جیسا کہ ماں باپ اپنی اولاد کا قصور معاف کرتے ہیں اس سے زیادہ اور بہت زیادہ وہ اپنے بندوں کا قصور معاف کرتا ہے اور میں نے قرآن شریف سے ہر ایک بات کا ثبوت دیا ہے پس اب ہر اک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جیسے اسلام نے پچھلے گناہوں سے عذاب سے بچنے کا طریق بتایا ہے اور جس قسم کی نجات اسلام نے بیان فرمائی ہے وہ کسی مذہب نے بیان نہیں کی اور چونکہ اسلام کی نجات ہی فطرت انسانی اور مشاہدہ قدرت سے اور عقل سے ثابت ہوتی ہے اس لئے سوائے اس کے اور کوئی نجات ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بااخلاق انسان تو رحم کے پتلے ہوتے ہیں مگر وہ خدا جو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان اور سب شفیقوں سے زیادہ شفیق ہے وہ اس صفت سے محروم ہو۔ گویا کہ وہ ایک معشوق ہے کہ جس کا ایک عضو ندارد ہے پس ایسا خدا قائم بالذات خدا ہو سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں پس یہ تمام نقص جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں صرف صفات الٰہیہ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ اسلام تمام زمانہ کی دست برد سے پاک ہے اور قرآن شریف ایک ہی محفوظ کتاب ہے اس لئے اس مسئلہ کو اسی کتاب نے ٹھیک طور پر حل کیا ہے اور ایسا پاک اور نقائص سے مبرّا خدا انسان کے سامنے پیش کیا ہے کہ جس کی شفقت اور رحمت کو دیکھ کر مردہ دل زندگی پاتے اور گمراہ ہدایت حاصل کرتے ہیں پس اصل نجات وہی ہے جو کہ اسلام نے بیان فرمائی ہے۔

ایک اور پہلو سے نظر ڈالنے پر بھی میرے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں تین قسم پر ہر ایک چیز منقسم ہوتی ہے۔ ادنیٰ اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ پر اوسط بہرحال افضل مانی جائے گی اور اوسط پر اعلیٰ کو فوقیت ہوگی۔ اور اس رو سے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم صفات میں سے ادنیٰ ہے کیونکہ اس کے معنی ہیں ایک چیز کو غیر موقعہ پر رکھنا اور اس طرح پر کسی کی حق تلفی کرنی اور اس سے اوپر پھر عدل کی صفت ہے کہ جس کے معنی ہیں کہ جس کا جتنا حق تھا اس کو اسی قدر دے دینا یعنی اگر کوئی شخص ایک روپیہ کا مستحق ہے تو اس کو بغیر کمی یا زیادتی کے ایک روپیہ ہی حوالہ کر دینا۔ اور

اس درجہ سے اوپر پھر ایک اور درجہ ہے جس کا نام ہے رحم جس کے معنی ہیں کہ ایک شخص کو جس قدر اس کا حق تھا اس سے زیادہ دے دیا جائے مگر اس سے کسی اور کی حق تلفی نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص نے ایک مزدور لگایا اور اس نے دو روپیہ کا کام کیا تو دو روپیہ کی بجائے اسے اگر تین دے دیئے تو یہ اس کا رحم ہے ہاں شرط یہ ہے کہ کسی اور کا حق مار کر ایسا نہ کیا گیا ہو کیونکہ اس صورت میں یہ رحم رحم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ خالق و مخلوق کے مدارج بھی ہم دیکھتے ہیں تو تین ہی ہیں ایک تو وہ لوگ جو شریر ہیں اور شیطانی آدمی کہلاتے اور اسکے متبع سمجھے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو کہ نیک ہوتے ہیں اور ایک خود اس کائنات کا وجود میں لانے والا پس ظلم تو اصل صفت شیطان کی ہے کہ اس کے متبع اس صفت سے متصف ہیں اور عدل اصل صفت نیک لوگوں کی ہے اور رحم اصل صفت خدا تعالیٰ کی ہے اور یہی مناسب تقسیم ہے کیونکہ شیطانی کام تو شیطان سے ہی سرزد ہوں گے اور چونکہ مخلوق خالق کے برابر نہیں ہو سکتی اس لئے ضرور ہے کہ اس کی اصل صفت وہ ہو جو کہ وسط میں ہے یعنی عدل۔ اور خالق کی صفت سب سے اعلیٰ ہو یعنی رحم چنانچہ قرآن شریف سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے اور کہیں خدا تعالیٰ نے ظلم کا لفظ اپنے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ یہی فرمایا کہ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا یعنی ہماری درگاہ میں فیصلہ کے وقت ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ اور نیک لوگوں کو رحم کی ترغیب دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ یعنی اللہ تعالیٰ تم کو نیک صفات میں سب سے پہلے عدل کی تعلیم دیتا ہے ہاں جب تم کمال حاصل کر لو تو تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے ماتحت تم کو پھر رحم کی صفت بھی اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے چنانچہ فرماتا ہے وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی لیکن سارا کا سارا قرآن شریف دیکھ جاؤ ایک جگہ بھی تم عدل کا لفظ خدا تعالیٰ کے لئے نہ پاؤ گے بلکہ یہی پاؤ گے اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جس سے معلوم ہؤا کہ خدا تعالیٰ کی اصل صفت رحم ہے جس کے ماتحت آکر عدل بھی ہو جاتا ہے ورنہ زیادہ تر وہ رحم سے ہی کام لیتا ہے پس قرآن شریف میرے اس دعوے کی تائید کرتا ہے اور یہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں جو میرا خود ساختہ ہو خود فطرت انسانی اس پر مہر کرتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ مخلوق و خالق کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ اول شیطان کہ جو ظلم کرتا ہے اور اس کی ترغیب دیتا ہے دوم خدا تعالیٰ کہ جو عدل کرتا ہے اور سب سے اعلیٰ مرتبہ پر انسان ہے کہ جو رحم کی صفت سے متصف ہے اور یہ ایک ایسا خیال ہے کہ جس کے ماننے کے لئے کوئی ذی عقل تیار نہیں۔ جس سے لازمی طور سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے خدا تعالیٰ ضرور رحیم کریم ہے اور اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور

ان کے پچھتانے پر ان کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ بلکہ نرمی کرتا ہے۔

اور اگر خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ رحیم نہ مانا جائے اور توبہ کو قبول کرنے والا نہ مانا جائے☆ تو ایک اور بھی عظیم الشان اعتراض پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارا خالق نہیں ہے کیونکہ خالق اپنی مخلوق کے خواص سے خوب واقف ہوتا ہے۔ اور فطرت انسانی میں ہم رحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہؤا پاتے ہیں پس اب دو صورتوں میں سے ایک صورت ہے یا تو آریوں' مسیحیوں کا خدا (نعوذ باللہ) ہمارا خالق نہیں کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ فطرت انسانی میں محبت اور رحم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہؤا ہے تب ہی تو وہ ہم کو وہ تعلیم دیتا ہے جو ہماری فطرت کے برخلاف ہے اور جب وہ ہماری فطرت کے برخلاف ہے تو اس پر عمل کرنا تکلیف مالایطاق ہے۔ اور اگر وہ ہمارا خالق ہے اور ضرور ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ضرور رحیم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ وہ ہماری فطرت میں تو یہ بات رکھ دے کہ رحم کو ہم عدل سے زیادہ سمجھیں۔ اور پسند کریں اور خود رحیم نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ہم کو (نعوذ باللہ) اس سے کبھی بھی محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔

اب میں خدا کے فضل و کرم سے قوانین فطرت اور نیچر سے ثابت کر چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ ضرور رحیم ہے اور توبہ کو قبول کرتا ہے کیونکہ محبت حسین سے ہوتی ہے اور رحم ایک بڑا حسن ہے۔ پس کسی صورت میں خدا تعالیٰ جو اصل معشوق ہے اس حسن سے خالی نہیں ہو سکتا اور یہ کسی صورت میں بھی ممکن نہیں کہ وہ مہربان خدا جو والدین سے لاانتہا درجہ زیادہ محبت کرنے والا ہے جبکہ اس کے آگے ہم پشیمان ہو کر جائیں اور شرمندگی سے اس کی دہلیز پر اپنی گردن جھکا دیں تو وہ ہم کو کند چھری سے ذبح کر دے اور اگر ایسا ہو تو خدا تعالیٰ اخلاق میں انسان سے بھی ادنیٰ متصور ہو گا جو ناممکن ہے۔ اور یہ بھی میں نے ثابت کیا ہے کہ اس عقیدہ سے پھر خدا تعالیٰ کے خالق ہونے سے بھی جواب دینا پڑتا ہے پس وہی طریق راست اور درست ہے کہ جو قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ میں آیات کے حوالوں سے ثابت کر آیا ہوں کہ خدا تعالیٰ ضرور رحیم ہے اور گناہوں کو وہ ضرور بخشتا ہے اور اس جیسا توبہ کو قبول کرنے والا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ کیونکہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے چنانچہ مسیحیوں کے لئے تو یہ مثال کافی ہے کہ جب یونسؑ نبی کی قوم پر اس کے کفر کی وجہ سے عذاب آیا تو ان کے چیخنے اور چلّانے پر وہ عذاب ہٹ گیا پھر یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو بخشا اور خدا نے اسے ملامت نہ کی خود مسیح کہتا ہے کہ:

☆ مسیحی خدا تعالیٰ کو رحیم تو کہتے ہیں اور آریہ دیالو کرپالو مانتے ہیں مگر چونکہ عملاً اس صفت کے منکر ہیں کیونکہ توبہ کے قبول کرنے اور گناہوں پر چشم پوشی کرنے میں اسے قاصر جانتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس مضمون میں اس جگہ لکھا ہے کہ وہ اس کے رحیم ہونے سے منکر ہیں۔

"اور جبکہ تم دعا کے لئے کھڑے ہوتے ہو۔ اگر تمہیں کسی پر کچھ شکایت ہو تو اسے معاف کرو تا کہ تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہارے قصوروں کو معاف کرے اور اگر تم معاف نہ کرو گے۔ تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے۔ تمہارے قصور معاف نہ کرے گا" (مرقس ۱۱ آیت ۲۵، ۲۶) آریوں کا خدا دیالو کرپالو ہے۔ اس سے بھی معاملہ فیصل ہو جاتا ہے۔

ان اعتراضوں کا جواب جو توبہ پر کئے جاتے ہیں

مسیحی صاحبان اور ان کی دیکھا دیکھی آریہ مہاشے توبہ کے مسئلہ پر پانچ اعتراض کرتے ہیں جن کا جواب دینا بھی میں اس جگہ ضروری سمجھتا ہوں اور گو کہ اس سے مضمون لمبا ہو جائے گا۔ مگر اس کے بغیر مضمون کا ایک حصہ ناقص رہ جاتا ہے اس لئے ضروری ہے۔

پہلا اعتراض پہلا اعتراض توبہ کی قبولیت پر یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے تو گویا ظالم ہے (نعوذ باللہ)۔

مگر ایسا اعتراض کرنے والے ظلم کی حقیقت کو جانتے ہی نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ میں اپنے مضمون میں ثابت کر آیا ہوں جب ایک شخص گناہوں سے پچھتا کر اور اپنی غلطی سمجھ کر واپس آتا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور سچی توبہ کرتا ہے تو اس وقت اس کی توبہ کا قبول نہ کرنا ایک حد تک ظلم کہلا سکتا ہے۔ مگر اس کی توبہ کو قبول کر لینا اور اس کے گناہوں پر چشم پوشی کرنا کوئی ظلم نہیں بلکہ احسان کہلاتا ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کسی پر احسان کرے تو اس پر کوئی الزام نہیں آتا بلکہ یہ بات اس کی شان کے شایاں ہے کیونکہ یہ بات ہر اک پر عیاں و مبرہن ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو اس کے کسی فعل کے بغیر کچھ روپیہ بطور احسان کے دے دے تو اس کو لوگ ظالم نہیں سمجھتے۔ بلکہ جیسے کہ میں بیان کر چکا ہوں ظلم کے معنی تو یہ ہیں کہ کسی شخص کی حق تلفی کی جائے اور جب تک کسی کی حق تلفی نہ ہو تو وہ عطا ظلم نہیں بلکہ احسان ہوتی ہے مثلاً ہم جو ایک فقیر کو کچھ دیتے ہیں تو ہمارے نوکر کبھی شکایت نہیں کر سکتے کہ تم نے ہم پر ظلم کیا بلکہ اگر ہم ان کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ کر فقیروں کو دیں تو اس وقت ان کی شکایت بجا ہو گی کہ ہمارا حق کسی اور کو کیوں دیا گیا یا مثلاً ایک آقا کسی مزدور کی کمزور حالت کو دیکھ کر اسے وقت سے پہلے رخصت کر دے تو اسے ظلم نہیں کہتے۔ ہم گورنمنٹ کو ہی دیکھتے ہیں کہ بعض قیدی اس لئے میعاد سے پہلے چھوڑ دیتی ہے کہ ان کی صحت خطرہ میں تھی۔

مگر کوئی نہیں جو گورنمنٹ کے برخلاف شکایت کرے کہ اس نے سخت ظلم کیا اور ملک میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ اس قیدی کو میعاد سے پہلے ہی چھوڑ دیا ہے کیونکہ سب دیکھتے ہیں کہ اس قیدی کی حالت قابل رحم تھی اور گورنمنٹ نے جو کچھ کیا بالکل مناسب کیا۔ پس اگر خدا تعالیٰ بھی کسی مجرم کی حالت قابل رحم دیکھے اور جان لے کہ شرم وحیا کی آگ سے اس کی ہوا و ہوس جل کر خاک ہو گئی ہے اور ندامت کے مارے اس کے لئے زندگی وبال جان ہے تو اسے کیوں نہ بخشے اور کیوں اس کے دل میں اطمینان پیدا نہ کر دے اور کیوں نہ کہے کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ غرض کہ گناہ کا بخشنا ظلم نہیں ہوتا۔ ظلم وہ ہے کہ جس میں کسی کی حق تلفی ہو اور اس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہاں بعض اوقات گناہوں کا نہ بخشنا ظلم ہو جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ گناہوں کو پسند کرتا ہے کہ توبہ کو قبول کرتا ہے کیونکہ جب انسان کو یقین ہو جائے کہ میں جتنے گناہ بھی کرلوں اور کتنے قصور بھی مجھ سے سرزد ہو جائیں ایک توبہ سے سب پر پانی پھر جائے گا اور میں پھر پاک وصاف ہو جاؤں گا اور کوئی دکھ اور درد مجھ کو نہ پہنچے گا اور کسی قسم کی سزا مجھ کو نہ ملے گی۔ تو اس صورت میں وہ گناہوں پر دلیر ہو جائے گا اور کہے گا کہ اب تو گناہ کرلو پھر توبہ کرلیں گے اور امن کی کوئی صورت نہ باقی رہے گی اور گناہوں کی کثرت سے دنیا بھر جائے گی مگر یہ اعتراض گو کوتاہ چشموں کی نظروں میں کچھ وقعت رکھے مگر قرآن شریف اور قوانین نیچر کے دیکھنے والے اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں کہ محض بے حقیقت ہے۔

کیونکہ جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں توبہ اصلاح کے لئے ہے نہ کہ فساد پھیلانے کے لئے اگر کوئی شخص توبہ کے مسئلہ کی آڑ میں گناہ پھیلانا چاہتا ہے تو وہ شریر اور فسادی ہے اور چونکہ معاملہ ایک علیم و خبیر ہستی سے ہے اس لئے اس کی یہ بات چل نہیں سکتی۔ ایک انسان دوسرے انسان کا ارادہ نہیں جان سکتا۔ مگر پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عدالتوں میں اس بات پر بڑے زور سے بحث ہوتی ہے اور جرح قدح ہوتی ہے کہ مجرم کا ارادہ کیا تھا اور چند قرائن سے ثابت کیا جاتا ہے کہ مجرم نے جو جرم کیا ہے اس کے سرزد ہوتے وقت اس کا ارادہ فساد کا تھا یا صلح کا اور دوسری بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ آیا جس وقت مجرم نے یہ جرم کیا اس وقت وہ کسی اشتعال یا جوش میں تھا یا ٹھنڈے دل سے اور سوچ بچار کر کے اس سے وہ فعل شنیعہ سرزد ہوا تھا۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے وہ کام نیک نیتی سے یا کسی خاص جوش یا غیرت یا غضب کے ماتحت کیا ہے۔ تو اس کے جرم کو یا تو معاف کیا

جاتا ہے یا سزا میں بہت تخفیف کی جاتی ہے۔ اور باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ جج کے پاس کوئی بدیہی ثبوت اس بات کا نہیں ہوتا کہ واقعی یہ فعل کس ارادہ سے ہؤا تھا۔ مگر جس ہستی کے ساتھ توبہ کا معاملہ درپیش ہے اسلامی عقائد کی رو سے وہ علیم و خبیر اور جبار (مصلح) ہے اور اسلام کا خدا ذرہ ذرہ سی بات کو جانتا ہے اور کوئی چیز نہیں خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی جو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو پھر اس سے کسی کا ارادہ کس طرح مخفی ہو سکتا ہے اور وہ بغیر ارادہ کا لحاظ کرنے کے کس طرح کسی مجرم کو سزا دے سکتا یا چھوڑ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ رحم کرتا ہے اور ظلم نہیں اور فساد نہیں بلکہ اصلاح چاہتا ہے۔ چنانچہ سورۃ مائدہ میں فرماتا ہے کہ لٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ (المائدہ: ۷) یعنی اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تم کو پاک کرے۔ پس ایسا شخص تو گند پھیلاتا ہے اور توبہ کے بہانہ سے دنیا میں فساد چاہتا ہے۔ پس وہ کب اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس گندے ارادہ کے ساتھ توبہ کے دروازہ میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ تو ایسے خبیث لوگوں کے لئے فرماتا ہے کہ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (الاعراف: ۵۶، ۵۷) یعنی خبردار خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے میں شوخی اور شرارت سے کام نہ لو۔ بلکہ جب اسے پکارو تو بڑی عاجزی اور تضرع سے پکارو اور علاوہ اس کے لوگوں سے بالکل الگ ہو کر بھی اسے یاد کرتے رہا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور یاد رکھو کہ وہ احکام جو بغرض اصلاح اترے ان کے نزول کے بعد فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو خوف و طمع سے یاد کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین سے قریب ہے پس اس جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو احکام اصلاح کے لئے اترے ہیں اگر تم باوجود ان کے اترنے کے فریبوں کے ساتھ شرارت اور فساد کی راہ تلاش کرو گے تو تمہارا انجام نیک نہ ہوگا۔

پس جو شخص اس بد ارادہ سے گناہ کرتا ہے کہ توبہ کی آڑ میں مَیں سزا سے محفوظ رہوں گا۔ وہ سخت دھوکے میں ہے اور سخت ٹھوکر کھائے گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ دھوکہ نہیں کھاتا۔ اور ایسا دھوکہ دینے والا انسان تو مؤمن ہی نہیں کیونکہ اس کو صفات الٰہیہ پر ایمان ہی نہیں کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ خدا تعالیٰ ان سب کمزوریوں سے پاک ہے پس اس قسم کے ارادہ والا انسان تو بجائے اس کے کہ توبہ سے کچھ فائدہ اٹھائے توبہ سے پہلے ہی ہلاک کیا جائے گا اور عذاب الٰہی اس پر نازل ہوگا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو ایسا ناقص سمجھتا ہے کہ وہ دھوکے میں آجاتا ہے اور اس وجہ سے اسے دھوکہ دینا چاہتا

ہے۔ دوسرے توبہ تو اسے کہتے ہیں کہ ایک شخص یک لخت اپنی غلطی پر آگاہ ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف آئے اور اس کا دل غم کے مارے پگھل جائے اور وہ رنج و الم کے پہاڑوں کے نیچے دب جائے مگر اس ارادہ سے گناہ کرنے والا انسان کہ میں ایک مدت تک گناہ کر کے پھر چھوڑ دوں گا تو پہلے سے ہی ایک سکیم تیار کر چکا تھا۔ اس کی جھوٹی توبہ توبہ کہلا ہی کب سکتی ہے اور ایسے شخص کا دل تو ایسا ہو گا کہ اسے توبہ کا موقعہ ہی نہ ملے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (المائدہ: ۱۰۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (المؤمن: ۲۹) وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ: ۲۵۹) پس پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے توبہ کا دروازہ کھول کر گویا گناہوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔

دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ مخالف کا اعتراض مان کر بھی توبہ گناہوں کی محرک تب ہو سکتی تھی کہ اگر انسان کو اس کی موت کا وقت بتا دیا جاتا کہ فلاں شخص فلاں وقت مرے گا اور فلاں فلاں وقت مرے گا۔ کیونکہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ کہتے کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لیں گے لیکن خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (لقمان: ۳۵) یعنی اللہ ہی جانتا ہے کسی کی مقررہ گھڑی کب آئے گی۔ اور وہی بارش نازل کرتا اور رحموں میں جو کچھ کہ ہے اسے جانتا ہے اور نہ کوئی جانتا ہے کہ اس نے کل کیا کچھ کمانا ہے اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ اس کو کس مقام پر موت آنی ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ تو بڑا جاننے والا اور خبردار ہے۔ پس اس آیت میں خدا تعالیٰ زمانہ اور مکان دونوں کی نفی فرماتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ نہ تو انسان یہ جانتا ہے کہ وہ کب مرے گا کیوں کہ اس صورت میں وہ موت سے پہلے توبہ کر سکتا ہے اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں مرے گا۔ کیونکہ اس صورت میں شریر آدمی اس مقام پر جاتے ہی نہ اور اگر جانا پڑتا تو وہاں رہنے کے زمانہ میں توبہ کرتے تب بیشک فساد کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ مگر انسان کو نہ اپنے مرنے کے ایّام معلوم نہ مقام معلوم اور علاوہ اس کے فرماتا ہے کہ وہ یہ بھی تو نہیں جانتا ہے کہ کل اس کے حالات کیسے ہوں گے آیا توبہ کی توفیق ملے گی یا نہیں کیونکہ وہ ناواقف ہے کہ کل اس نے کیا کمانا ہے۔ پس اس آیت نے اس اعتراض کا کامل جواب دے دیا ہے کیونکہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ بوڑھے ہی نہیں بچے بھی اور جوان بھی اور ادھیڑ بھی مرتے رہتے ہیں اور بیماریاں انسان پر ایسی اچانک آتی ہیں کہ ایک منٹ میں جان کا خاتمہ کر دیتی ہیں بعض دفعہ

دیکھا گیا ہے کہ انسان سوتے سوتے مرگیا۔ بعض دفعہ محفل دوستاں میں قہقہہ لگاتے لگاتے جان نکل گئی۔ بیٹھے تھے کھڑے ہوئے اور گر کر مر گئے۔ کام کرتے ہوئے دل کو ایسا صدمہ پہنچا کہ دستخط نصف ہی رہ گیا اور مرغِ روح قالبِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ سیڑھیاں چڑھنے لگے کہ ایک پیر اوپر رکھا اور ایک نیچے کہ جان نکل گئی۔ دیوالہ نکل گیا اور ساتھ ہی پیغام اجل بھی آگیا۔ ایک دست آیا اور ختم۔ نکسیر پھوٹی اور سرد ہو گئے۔ ہیضہ آیا اور چل دیئے۔ طاعون آئی اور گھر کا گھر برباد کر گئی۔ غرض ایک نہیں لاکھوں نظیریں ہر سال اس قسم کی پائی جاتی ہیں وبائیں' اندرونی اور بیرونی بیماریاں' رنج و غم' دشمنوں کے حملے' لڑائیاں' فساد' بغاوتیں' زلزلہ' طوفان' بجلیاں ہزاروں چیزیں ہیں کہ انسان کی جان کے درپے ہیں اس سے بچے تو اس میں جا پڑے' اس سے نجات پائی تو تیسری در پیش ہے غرضیکہ اس صورت میں ممکن ہی نہیں کہ انسان کہے کہ اب تو گناہ کر لو پھر توبہ کر لیں گے ممکن ہے کہ اس ارادہ کے دل میں آتے ہی جان نکل جائے۔ پس چونکہ موت کا نہ زمانہ نہ مکان انسان کو بتایا گیا ہے اس لئے توبہ پر یہ اعتراض نہیں آسکتا کہ اس طرح گناہوں پر دلیری ہو گی اور یہ اعتراض تو خود مسیحی صاحبان پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ جب کفارہ پر ایمان لانے سے انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے تو کفارہ بدرجہ اولیٰ بدیوں کی ترغیب دلانے والا ہے۔

توبہ کے مسئلہ پر اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کی عقلوں پر تو مجھ کو سخت تعجب آتا ہے کیونکہ توبہ جن لوگوں کے لئے ہے ان کا ذکر تو خود قرآن شریف نے کر دیا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ- اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (آل عمران: ۱۳۶' ۱۳۷) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ انہیں لوگوں کے لئے ہے جو شرارت سے فساد پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ غلطیوں یا غفلت کی وجہ سے گناہوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور پھر اپنے گناہ پر اصرار نہیں کرتے پھر قرآن شریف میں ایک دوسری جگہ پر ہے وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام: ۵۵) اس آیت سے علاوہ اس کے کہ خدا تعالیٰ کی رحیمیت ثابت ہوتی ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ توبہ انہی لوگوں کے لئے ہے جو مذہب' ملک' رسم و عادت' نامناسب تعلیم' ضد اور غفلت اور بد صحبت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں نہ کہ ان کے لئے جو

شرعی احکام میں حیلہ جوئی کرتے اور اس طرح فساد کا راستہ تلاش کرتے ہیں پس توبہ کے مسئلہ پر کسی صورت سے بھی یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا کہ اس سے گناہوں کی تحریک ہو گی بلکہ یہ تو گناہوں کی بیخ کنی ہے اور دوسرے یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ ساتھ ہی فرماتا ہے واصلح یعنی نہ صرف زبانی توبہ کرے۔ بلکہ اس حد تک وہ توبہ میں بڑھ جائے کہ اس کا اثر آکر بدن پر بھی پڑے۔ اور اس توبہ کرنے والے کے اعمال بھی اس بات پر گواہی دیں کہ واقعی وہ صادق ہے اور اپنے دعوے میں مفتری نہیں اور وہ کوشش کرے کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کی اصلاح ہو جاوے اور نیکی میں اس قدر علوّ کرے کہ اس سے اس کے پچھلے اعمال بھی دھوئے جائیں مثلاً ایک شخص اگر بخیل تھا تو یہی نہیں کہ اپنا بخل چھوڑ دے بلکہ کامل توبہ تب ہو گی کہ وہ سخاوت بھی اختیار کرے۔ بلکہ اور کو بھی اس طرف مائل کرے تب بیشک وہ اس قابل ہو گا کہ اس کے پچھلے گناہوں پر چشم پوشی کی جائے۔ اب بتاؤ کہ کیا اس تعلیم سے گناہ پھیلتا ہے کہ رکتا ہے۔ آیا وہ شخص جو توبہ کی تعلیم کے ماتحت بخل سے اس قدر بچ کر سخاوت کا محرک ہؤا ہے گناہ کا پھیلانے والا کہلائے گا یا دور کرنے والا۔

تیسرا اعتراض

ایک اور اعتراض توبہ کی قبولیت پر آریوں کی طرف سے یہ سنا جاتا ہے کہ جو ہو گیا وہ اَن ہُؤا کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ جس شخص نے ایک گناہ کیا فرض کرو کہ کسی کے گھر چوری کی تو اگر وہ توبہ کرے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کا وہ فعل رہے ہی نہ اور اس کا وجود ہی معدوم ہو جائے کیونکہ جو کچھ ہو چکا وہ اب واپس لوٹ نہیں سکتا۔ پھر توبہ کے قبول کرنے کے کیا معنی کیونکہ جب ایک گنہگار ایک کام کر چکا تو اسے یہ کہنا کہ اس نے کیا ہی نہیں غلط اور خلاف عقل طریق ہے۔

گو کہ یہ اعتراض آریوں کی طرف سے اکثر سنا گیا ہے مگر مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس دماغ سے نکلا ہے۔ قرآن شریف ہرگز کہیں نہیں کہتا کہ جس شخص نے گناہ کیا اور اس کے بعد توبہ کر لی اور وہ توبہ قبول ہو گئی تو اس شخص کا گناہ ایسا محو ہؤا کہ یہ مت کہو کہ اس نے گناہ کیا تھا بلکہ کہو کہ اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن شریف نے تو اس کا نام ہی غفران رکھا ہے یعنی ڈھانپ دینا۔ اور بار بار فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ اس گناہ کو ڈھانک دیتا ہے۔ چنانچہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے گناہوں کو ہم بخشتے ہیں یہ نہیں کہ لکڑی سے یا چاقو سے ان کے گناہوں کو کھرچ دیتے ہیں بلکہ ان کے گناہوں کے نتیجے سے ان کو بچا

لیتے ہیں۔ مثلاً ایک نوکر ہم کو ناراض کرے اور ہمارا کوئی کام خراب کردے مگر پھر توبہ کرے اور اپنی غلطی کا اقرار کرے اور اپنی سچائی کو پوری طرح سے ظاہر کردے اور ثابت کردے کہ بیشک اب وہ سخت پشیمان ہے تو ہم اس کا کوئی اپریشن نہیں کرواتے نہ اس پر کوئی عمل جراحی کرتے ہیں کہ جس سے اس نے جو کچھ قصور کیا تھا وہ معدوم ہو جائے بلکہ یہی کرتے ہیں کہ جو اس نے کیا تھا اس کے نتیجہ سے اس کو بچالیتے ہیں اور سزا نہیں دیتے۔

خود لفظ توبہ کے معنی ہی رجوع کرنے کے ہیں یعنی جب انسان کچھ قصور کرتا ہے تو پھر وہ اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے اور اپنی پہلی حالت کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت مالک بھی اپنی مہربانی کی طرف لوٹ آتا ہے اور پہلا سا سلوک کرنے لگتا ہے پس توبہ کے قبول ہونے کے یہی معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ اس فعل کی جو انسان سے سرزد ہوا تھا سزا نہیں دیتا بلکہ اپنی پہلی مہربانی پر لوٹ آتا ہے۔ پس اس سے تو قطعاً یہ نہیں پایا جاتا کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوا۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ انسان نے گناہ کر کے پشیمانی ظاہر کی اور خدا تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی اور سزا سے بچالیا۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا لوگ ہمیشہ گناہ کرتے ہیں اور شریف اور محسن آقا ان کے گناہ بخشا ہی کرتے ہیں۔ ابھی بادشاہ جارج پنجم کے تخت نشین ہونے پر پانچ سو سال کی قید معاف کی گئی ہے۔ کیا گورنمنٹ نے ان کے قصور کسی طرح مٹا دیئے تھے یا کسی خاص اوزار سے چھیل دیئے تھے؟ اگر گورنمنٹ بغیر کسی دقت کے یہ کام کر سکتی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کے پچھلے گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور اگر کرے تو اسی صورت میں کہ پہلے کسی ہتھیار سے ان کے گناہوں کو چھیل دے۔ افسوس اور تعجب ہے اس قسم کے معترضین پر۔

چوتھا اعتراض

توبہ کی قبولیت پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر توبہ واقعی قبول ہوتی ہے تو چاہئے کہ ایک زانی جب توبہ کرے تو زنا کے سبب سے جو آتشک یا سوزاک اسے ہوا تھا وہ دور ہو جائے۔ اسی طرح دوسرے نتائج جو گناہ کی وجہ سے بھگت رہا ہے ان سے نجات پا جائے مگر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ آتشک کا مریض ہزار توبہ کرنے پر پھر بھی اسی مرض میں گرفتار رہتا ہے یا کسی اور گناہ کی وجہ سے اسے کوئی صدمہ پہنچ گیا تھا۔ تو وہ بھی موجود رہتا ہے دور نہیں ہوتا تو ہم کس طرح مان سکتے ہیں کہ توبہ کا کوئی اثر ہے اور واقعی اس سے انسان بدی کے نتائج سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جسم سے اور ایک روح سے اور دونوں کے

الگ الگ کام ہیں اور الگ الگ طریق سے وہ اپنی غذائیں حاصل کر رہے ہیں ہر ایک کی بیماریاں الگ ہیں اور ان کے علاج بھی پھر الگ الگ ہی ہیں ایک کسی بات سے فرحت حاصل کرتا ہے تو دوسرا کسی اور ہی بات سے مگر باوجود اس کے چونکہ آپس میں دونوں کے تعلقات بہت ہیں اور مضبوط ہیں۔ اس لئے شدت فرح یا شدت غم میں ایک دوسرے پر اثر کرتے ہیں چنانچہ بعض لوگ کوئی خوشی کی خبر سن کر موٹے ہو جاتے ہیں یا غم کی خبر سن کر کمزور ہو جاتے ہیں اور ضعف محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اسی طرح گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو خالص روحانی ہیں۔ اور ان کا اثر جسم پر نہیں پڑتا۔ اور ایک گناہ وہ ہیں کہ جن میں روح اور جسم دونوں شریک ہوتے ہیں پس جن گناہوں میں جسم و روح دونوں شریک ہوتے ہیں ان میں اکثر دونوں کو ہی سزا ملتی ہے۔ پس جو شخص توبہ کرتا ہے اگر اس کو جو سزائیں ملتی ہیں صرف روحانی ہیں تو اس کے لئے اپنے اعتقاد کی درستی اور سچی توبہ کرنی ضروری ہے اور اگر یہ توبہ اپنی حد کو پہنچ جائے گی تو اس کا گناہ بخشا جائے گا۔ اور وہ اپنے دل میں ایک فرحت محسوس کرنے لگے گا لیکن اگر وہ گناہ جسم و روح دونوں سے مشترک سرزد ہؤا ہے تو چاہئے کہ دونوں ہی مل کر توبہ کریں اور اگر اس صورت میں توبہ کامل ہوگی تو دونوں سزا سے محفوظ ہو جائیں گے اور اگر روحانی توبہ کامل اور جسمانی ناقص ہوگی تو روح تو بچ جائے گی لیکن جسم اپنی سزا بھگتتا رہے گا۔ مثلاً ایک شخص نے زنا کیا تو ایک تو اس کی روح نے خدا تعالیٰ کا گناہ کیا اور ایک اس کے جسم نے کہ وہ بھی روح کے شریک حال ہؤا۔ پس ایک تو وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں گناہ گار ہو کر روحانی عذاب کا مستوجب ہوگا۔ خواہ وہ یہاں ملے یا آخرت میں اور ایک سزا اس کے جسم کو ملے گی اور وہ آتشک یا سوزاک کی شکل میں ہوگی۔ پس اگر ایسا شخص توبہ کرتا ہے تو اگر اس کی توبہ کامل ہے یعنی اس نے پورے طور سے اپنے گناہوں کی معافی بھی چاہی اور سچے دل سے علاج بھی کروایا تو ایسا شخص اس گناہ کی سزا سے بچ جائے گا۔ اور اگر اس نے روحانی توبہ تو نہ کی۔ مگر علاج کروایا اور وہ اپنی حد کو پہنچ گیا تو اس کا جسم سزا سے بچ جائے گا۔ یعنی آتشک سے وہ نجات پا جائے گا مگر اس کی روح اب بھی گنہگار رہو گی اور اگر روحانی توبہ کامل ہوگی اور علاج میں کسی وجہ سے نقص رہا۔ تو روح بچ جائے گی۔ مگر جسم سزا بھگتتا رہے گا۔

پس چونکہ جسم اور روح الگ الگ حصہ ہیں اور ان دونوں کے علاج الگ الگ ہیں اس لئے دانا انسان وہی ہے کہ جو توبہ کے وقت خیال رکھے کہ میں نے گناہ صرف روحانی کیا ہے یا اس میں

میرا جسم اور روح دونوں شامل تھے اور میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں بھگت رہا ہوں پس اگر وہ دونوں حصوں میں سزا محسوس کرتا ہے تو دونوں کا علاج الگ الگ طریق سے کرے اور وہ یہی ہے کہ روح کا علاج روحانی کرے اور توبہ و استغفار سے کام لے اور جسم کا جسمانی یعنی طبی علاج کرائے۔

پس جو شخص صرف توبہ و استغفار سے کام لیتا ہے اور اس کے جسم نے جو گناہ کیا تھا اس کی تلافی نہیں کرتا تو ایسا شخص اگر اپنی جسمانی سزا سے نہیں بچا تو اسلام کے بتائے ہوئے توبہ کے مسئلہ پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ اس شخص کی توبہ تو کامل ہی نہیں ہوئی کیونکہ اس نے خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستہ کو یعنی طبی علاج کو ترک کیا اور اسے اختیار نہیں کیا۔ پس ضرور ہے کہ جس حصہ میں اس کی توبہ ناقص رہی ہے اس میں وہ سزا پائے۔

لیکن جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں چونکہ روح کا جسم سے کمال درجہ کا تعلق ہے اس لئے بعض دفعہ روح کا اثر جسم پر بھی پڑ جاتا ہے اور کوئی بات روح پر کمال درجہ کا اثر کرے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ جسم بھی اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں کی توبہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ روح شدت اثر سے تڑپ اٹھتی ہے اور وہ توبہ کی ضروری شرط عمل صالحہ سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کامل طور سے کر لیتے ہیں۔ اور ان کے دل میں ایسی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے کہ نہ صرف پچھلے گناہوں کی بھی تلافی ہو جاتی ہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی ان کے خدائے تعالیٰ سے ایسے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ غیر منقطع ہوتے ہیں تو اس صورت میں دیکھا جاتا ہے کہ روحانی توبہ ہی جسم پر اثر کرتی ہے اور بغیر کسی جسمانی علاج کے وہ لوگ اپنے جسمانی دکھوں سے بھی نجات حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ اس کی مثالیں بزرگان اسلام کی لائف میں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا ایسا ہؤا ہے کہ بعض لوگوں کی توبہ جب کمال درجہ کو پہنچ گئی تو نہ صرف ان کی روح نے ہی نجات پائی بلکہ اس دنیا میں اس کا اثر نمودار ہؤا۔ اور وہ دکھ جو ان کے پچھلے گناہوں کی وجہ سے ان کا جسم پا رہا تھا وہ بھی خود بخود دور ہو گئے۔ اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ واقعی اس شخص کی توبہ نے اپنا اثر کیا۔ ہمارے حضرت مرزا صاحبؑ کی دعاؤں سے ہی ہم نے بہت دفعہ مشاہدہ کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے شفاء حاصل کی اور روحانی بیماریوں کے ساتھ جسمانی بیماریوں سے بھی نجات پائی۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ توبہ سے کبھی بھی جسمانی بیماریاں دور نہیں ہوئیں۔ بلکہ ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی ہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ توبہ خود اس درجہ کامل ہو جائے کہ وہ جسم پر بھی اثر کرے یا کسی کامل انسان

کی دعا ساتھ مل جاوے کہ جو اس کے لئے رحمت کا باعث ہو جائے- چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں طب رہ گئی وہاں توبہ و دعا نے کام نکال دیا- حضرت نوح علیہ السلام کے لفظ ہی تھے کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (نوح: ۲۷) کہ جنہوں نے آدمیوں پر ہی نہیں پانیوں پر بھی اثر کر دکھلایا- مسیحؑ کے پاس جب اندھوں اور کوڑھیوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی تو اس نے ان کو اچھا کیا- کیا یہ جسم پر اثر نہ تھا- رسول اللہؐ کے مخالفین نے جب قحط کا عذاب پایا اور گھبرا کر توبہ کی تو بارش نازل ہوئی اور بارش سے تنگ آگئے تو بند کی گئی یہ اجسام پر ہی اثر تھا یا کچھ اور- ہمارے حضرت صاحب کے پاس کئی بیمار آئے اور آپ نے ان کو بھی توبہ کرنے کے لئے کہا اور دعا بھی کی آخر وہ لوگ اپنے دکھوں سے بچ گئے- پس کون کہہ سکتا ہے کہ توبہ سے جسمانی بیماریاں کیوں دور نہیں ہوتیں- جب توبہ کامل ہوتی ہے تو ضرور ہوتی ہیں- مگر چونکہ انسان جسم اور روح سے مرکب ہے اس لئے اسے عموماً چاہئے کہ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی توبہ کرے اور جسم کی بیماریوں کے لئے جسمانی توبہ یعنی علاج اور یہی اصل اور سچا طریق ہے ہاں خداتعالیٰ نے مخالفین کا منہ بند کرنے کے لئے ایسی مثالیں بھی پیدا کر چھوڑی ہیں کہ صرف توبہ و دعا سے جسمانی بیماریاں بھی دور ہو جاتی ہیں اگر کوئی شپر چشم انکار کرے تو اور بات ہے-

پانچواں اعتراض

اگر توبہ کا مسئلہ ایسا ہی سچا اور پکا ہے تو دنیاوی گورنمنٹیں کیوں مجرموں کو ان کے توبہ کرنے پر چھوڑ نہیں دیتیں؟-

یہ اعتراض بھی توبہ کے منکر بہت کیا کرتے ہیں کہ کیوں دنیا میں لوگ ایک دوسرے کی توبہ قبول نہیں کر لیا کرتے- اور عدالتیں کیوں سزا دیتی ہیں- کیوں نہیں مجرموں کے اقرار پر اور آئندہ احتیاط کے وعدہ پر ان کو چھوڑ دیتیں-

یاد رہے کہ جیسا کہ پہلے میں لکھ آیا ہوں خداتعالیٰ علیم و خبیر ہے اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے- اور سچے اور جھوٹے کو جانتا ہے اور خفیہ اور پوشیدہ اسرار اس پر ظاہر ہیں اور کوئی بات نہیں جو اس سے پوشیدہ ہو خواہ سمندروں کی تہہ میں کوئی چیز بیٹھی ہوئی ہو یا پانیوں کی گہرائیوں میں- خواہ مچھلی کے پیٹ میں' خواہ عمیق کانوں میں' خواہ پہاڑوں میں' خواہ کنووں میں' خواہ ہواؤں میں ملی ہوئی ہو' خواہ انسانی دماغ میں خیالات کے رنگ میں پوشیدہ ہو' خواہ آسمان پر ہو' خواہ زمین میں' خواہ مادی ہو' خواہ غیر مادی' خواہ زمانہ ماضی کی ہو یا حال کی یا استقبال کی وہ ایسا علیم ہے کہ کوئی معلوم اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں پس اس کا توبہ کو قبول کرنا اور رنگ کا ہے اور گورنمنٹ کا

حال اور ہے۔ گورنمنٹ کے جج مدعی اور مدعا علیہ دونوں کا حال نہیں جانتے۔ ان کو کیا معلوم کہ آیا اپنی غلطی پر پریشان و پشیمان ہونے والا انسان واقعہ میں سچا ہے یا شرارت کرتا اور سزا سے بچنا چاہتا ہے۔ پس جس کو دوسرے کے ارادہ اور خیالات سے واقفیت ہی نہ ہو تو وہ کس طرح جرأت کر کے اسے چھوڑ سکتا اور معاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ مجرم جسے مجسٹریٹ چھوڑنے کی نیت رکھتا ہو اپنے دل میں یہ ارادہ کر رہا ہو کہ اب کے چھوٹے تو ضرور ایسی احتیاط سے جرم کروں گا کہ کسی کو علم ہو ہی نہ سکے مجسٹریٹ کی حالت تو بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ وہ بے چارہ تو بالکل اندھیرے میں ہوتا ہے اور اصلی حالت سے ناواقف۔ اسے تو خود ظالم و مظلوم میں ہی امتیاز نہیں ہوتا اور محض تاریکی میں پڑا ہؤا اندازوں سے کام لیتا ہے اور حاطب اللیل کی طرح خطا و ثواب دونوں کا مرتکب ہوتا ہے۔

لطیفہ۔ کہتے ہیں کہ ایک بزرگ شہر کے قاضی مقرر کئے گئے تو ان کے دوست ان کو ملنے گئے اور بڑی خوشی ظاہر کی اور مسرت کا اظہار کیا مگر جب اندر بلائے گئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ بڑے زور سے رو رہے ہیں اور کثرت گریہ وزاری سے ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں اور سانس اکھڑا ہؤا ہے دوستوں نے کہا حضرت اس وقت یہ رونا کیسا اور اس بے موسم کی برسات کے کیا معنی۔ یہ تو خوشی کا وقت تھا اور دعوتوں کا موقعہ آپ اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں اس بزرگ نے جواب دیا کہ احمقو تم نہیں جانتے کہ میں کیسی خطرناک حالت میں ہوں۔ میں ایک نابینا ہوں جو دو بیناؤں کے فیصلہ کے لئے مقرر کیا گیا ہوں اور ایک جاہل ہوں جو دو عالموں کے فیصلہ کے لئے چنا گیا ہوں کیونکہ مدعی اور مدعا علیہ میرے پاس آئیں گے اور وہ دونوں اپنا اپنا حال خوب جانتے ہوں گے کہ ہم جھوٹے ہیں یا سچے ہیں مگر میں بالکل ناواقف اور جاہل ان کا فیصلہ کروں گا۔ کیا یہ خوش ہونے اور فرحت ظاہر کرنے کا موقعہ ہے یا رنج و غم میں کڑھنے کا۔

اس لطیفہ میں جو جج صاحب کی حالت بیان کی گئی ہے۔ واقعہ میں صحیح اور درست ہے۔ اور اس میں سرِ مُو فرق نہیں۔ پھر باوجود اس قدر عجز کے جج کیا کر سکتا ہے اور کس طرح ایک مجرم کو بخش سکتا ہے جبکہ وہ نہیں جانتا کہ یہ شخص شرارتی ہے یا سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی کے دل میں کیا مخفی ہے وہ شرارتی اور سچے آدمی میں فرق کر سکتا ہے اور دونوں کے ارادوں کو جانتا ہے۔ اس لئے وہ توبہ قبول کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ گورنمنٹ اور خدا تعالیٰ کے احکام کا آپس میں مقابلہ کرنا ہی سخت غلطی ہے۔

کیونکہ خدا تعالیٰ تو مالک ہے اور ہر چیز اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ اور اس کے قبضہ قدرت میں ہے بر خلاف اس کے بادشاہوں اور گورنمنٹوں کے حالات اور ہیں کیونکہ وہ اپنی رعایا کے مالک نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کے جھگڑوں اور فسادوں کے دور کرنے کے لئے ججوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور خواہ بظاہر ایک گورنمنٹ دوسرے ملک کو بزور بازو ہی فتح کرے اور اپنا مال و دولت ہی خرچ کر کے اس پر قابو پائے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا حال ایسا ہی ہے کہ جیسے چند آدمی مل کر ایک شخص کو مقرر کر دیں کہ تم ہمارا فیصلہ کیا کرو تاکہ ہم میں جھگڑے اور فساد نہ پڑیں۔ پس جیسا کہ اس شخص کا کام نہیں کہ کسی کو کچھ دے دے یا رحم کر کے معاف کرے ایسا ہی گورنمنٹ کا بھی یہ کام نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کسی پر خاص رحم کرے کیونکہ وہ تو ایک ایجنٹ کی طرح ہے جسے پبلک نے اپنے کام نکالنے کے لئے مقرر کیا ہے اور پھر جو گورنمنٹ کی طرف سے جج مقرر ہوتے ہیں ان کا تو بالکل کوئی دخل ہی نہیں کیونکہ نہ صرف وہ لوگوں کے حقوق کے مالک ہی نہیں بلکہ علاوہ اس کے وہ مقرر ہی اس کام پر کئے گئے ہیں کہ جیسے واقعات ان کے سامنے پیش کئے گئے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کر دیں۔ اور گورنمنٹ نے ان کا اختیار ہی اس حد تک رکھا ہے پس ان کا مقابلہ خدا تعالیٰ سے کرنا کیسا سفیہانہ فعل ہے کیونکہ یہ لوگ تو کوئی بھی اختیار نہیں رکھتے اور پبلک سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کا فرض منصبی یہی ہے اور وہ اس بات کی تنخواہ لیتے ہیں کہ فریقین کے حالات سن کر اپنے اختیارات کے اندر اندر کسی کو چھوڑ دیں۔ اور کسی کو سزا دے دیں لیکن خدا تعالیٰ تو کسی کا مقرر کردہ نہیں ہے اور نہ وہ ان کی طرح بے اختیار ہے بلکہ چونکہ اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور بنایا ہے اور پھر اس کی زندگی کے قائم رکھنے کے لئے اور مختلف اشیاء کو بھی خلق کیا ہے اور اس کے آرام کے لئے طرح طرح کے سامان مہیا کئے ہیں اس لئے وہ انسان کا بلکہ ہر ایک چیز کا مالک ہے اور اس پر تصرف رکھتا ہے اور پھر بدلہ دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ پس اگر وہ کسی پر رحم کرے تو یہ اس کے شایان شان ہے۔ لیکن اگر جج بلا اختیار کے کسی پر رحم کرے تو گویا امانت میں خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کام کرتا ہے جو اس کے سپرد نہ تھا اور اگر اسے اختیار ہوتا اور پھر کسی پر رحم کرتا تو اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔ اور خدا تعالیٰ مالک ہے اس لئے اسے رحم کرنے کا پورا اختیار ہے اور یہی وجہ ہے کہ جج عام طور پر رحم نہیں کرتا بلکہ عدل کرتا ہے اور خدا تعالیٰ عام طور پر عدل ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ رحم بھی کرتا ہے پس ججوں یا گورنمنٹ کا مقابلہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کرنا بیوقوفی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بھی غلط ہے کہ گورنمنٹ رحم نہیں کرتی بلکہ گورنمنٹ کے رحم کثرت

سے پائے جاتے ہیں دیگر گورنمنٹوں کو جانے دو- ہندوستان کی گورنمنٹ کو ہی لے لو کہ جہاں مجرموں کی سزاؤں کے لئے اور مختلف قوانین بنائے گئے ہیں- وہاں ساتھ ایک مدرحم کی بھی رکھی گئی ہے- چنانچہ صوبوں کے افسروں اور پھر وائسرائے کا اختیار ہے کہ کسی مجرم کو خاص حالات کے ماتحت معاف کردے چنانچہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص چیف کورٹ تک سے مجرم قرار دیا گیا اور مستوجب سزا ہؤا- لیکن لیفٹنٹ گورنر نے یا وائسرائے نے اس کے حالات پر غور کرکے قابل رحم سمجھا اور صاف معاف کردیا- ابھی پیچھے لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ گورنمنٹ برطانیہ کی خاص مہربانی اور وزیر ہند کے حکم سے جلاوطنی کی سزا سے آزاد کئے گئے پھر بنگالہ کے سربر آوردہ لوگ جو محسن کشی کے خطرناک جرم میں قید کئے گئے تھے معاف کردیئے گئے اور اپنے گھروں میں امن وامان سے زندگی بسر کررہے ہیں- بیسیوں قاتل چھوٹ چکے ہیں اور طرح طرح کے مجرم رحم سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں خاص خاص موقعوں مثلاً تاجپوشی، تخت نشینی، جشن وغیرہ پر بھی بہت سے قیدیوں کی سزا کو معاف کردیا جاتا ہے- پھر یہ کہنا کہ گورنمنٹ کیوں رحم نہیں کرتی کہاں تک درست ہو سکتا ہے-

جہاں تک مجھے علم تھا کہ توبہ کے مسئلہ پر یہ اعتراض ہؤا کرتے ہیں ان کا جواب تو میں لکھ چکا ہوں- اب مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں (انشاء اللہ) کہ دیگر مذاہب یعنی مسیحی اور آریہ اگر توبہ کے مسئلہ کو قبول نہیں کرتے تو وہ اس کی جگہ کیا تعلیم پیش کرتے ہیں اور وہ کہاں تک درست ہے-

گناہوں کی معافی کے بارے میں مسیحی تعلیم

پہلے میں مسیحی تعلیم کو دیکھتا ہوں کہ وہ انسان کے پچھلے گناہوں کی معافی کی نسبت کیا فتویٰ دیتی ہے اور وہ ہماری تسلی کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرتی ہے-

چنانچہ مسیحی کتب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے گناہ سوائے اس کے کہ وہ مسیح کے کفارہ پر ایمان لائے نہیں معاف ہو سکتے اور جب تک وہ یہ یقین نہ کرلے کہ مریم کا بیٹا یسوع جو اصل میں خدا ہی کا بیٹا تھا اور یہ کہ وہ انسان کے گناہ اپنے سر پر اٹھا کر مظلومیت کی حالت میں مصلوب ہؤا تب تک نجات غیر ممکن ہے- لیکن اس میں بہت سی دقتیں ہیں اول تو یہ کہ مسیحی صاحبان کے اس دعوے کے ثبوت کے لئے سخت مشکلات ہیں- سب سے اول جو مشکل پڑتی ہے وہ

تثلیث کا ثبوت ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ خدا تین ہیں اور کفارہ کے مسئلہ کے لئے سب سے پہلے ان کو یہی بات ثابت کرنی ضروری ہے کیونکہ جب تک تین خدا ثابت نہ ہوں تو ایک خدا کا ان میں سے مصلوب ہونا باطل ٹھہرتا ہے اور گو محض مادی اشیاء اور عقلی دلائل سے خدا تعالیٰ کا وجود بھی ثابت کرنا ایک حد تک مشکل ہے لیکن اسے مان کر بھی یہ سب کائنات عالم اگر کسی پیدا کرنے والے کو چاہتی ہے اور چونکہ کوئی مصنوع بغیر صانع کے نہیں ہوتا اس لئے کسی صانع عالم کے وجود کا اقرار کرنا پڑتا ہے لیکن اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہستی ایسی چاہئے کہ جو اس عالم کی خالق ہو مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایک سے زیادہ ہستیاں ہیں۔ اگر بفرض محال مانا جائے کہ وہ ایک سے زیادہ ہیں تو کیوں دو نہ مانی جائیں یا چار تصور نہ کی جائیں تین کی کیا خصوصیت ہے۔ پس مسیحی صاحبان کے لئے اول تو تثلیث کا ثابت کرنا ہی ناممکن ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ ثبوت دے سکتے ہیں وہ ایک خدا کو ثابت کرتا ہے زیادہ کو نہیں اور اگر ایک سے زیادہ خدا تصور کئے جاسکیں تو پھر ہر ایک کو حق ہے کہ وہ دو خدا مانے یا چار مانے یا پانچ مانے اس میں کوئی ہرج نہیں۔ پس جبکہ تثلیث کا ثابت کرنا ہی مشکل ہے۔ نہیں بلکہ اس کے لئے کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ تو پھر مسیح کا کفارہ آپ ہی باطل ہو گیا اور اگر وہ مان بھی لی جائے تو اب یہ دقت ہے کہ ایک کو باپ اور ایک کو بیٹا کیوں مانا جائے۔ یہ کس دلیل سے ثابت ہے کہ ایک باپ ہونا چاہئے۔ اور ایک بیٹا اور ایک روح القدس اور کیوں نہ کہا جائے کہ تینوں باپ ہی ہیں۔ یا تینوں بیٹے ہی ہیں یا تینوں روح القدس ہی ہیں اور یہ کیوں خیال کیا جائے کہ مسیح بیٹا تھا کیوں نہ اس کو باپ تصور کیا جائے۔ پس تثلیث کے مسئلہ کے بعد یہ بہت سے سوال ہیں جو حل کئے جانے ضروری ہیں اور پھر یہ سوال بھی حل کرنے کے قابل ہے کہ اگر تین ہی خدا ہیں اور ہے بھی ایک بیٹا اور ایک باپ اور ایک روح القدس تو پھر مسیح ہی کو تیسرا خدا کیوں مانا جائے اور لوگ بھی ہیں جو کہ مسیح سے بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں ان کو کیوں نہ خدا خیال کیا جائے۔ اور اگر مصیبتوں اور تکلیفوں کے اٹھانے پر ہی خدا کا دارومدار ہے تو ایسے لوگ بھی کم نہیں جو اپنے ملک کو ترقی دینے کے لئے بڑے بڑے عذاب برداشت کر کے مر گئے ان کو اس مرتبہ سے کیوں محروم رکھا جائے۔ اور اس کے علاوہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ آیا خود یسوع بھی اس کے لئے تیار تھا کہ نہیں اور اسے اس کی مرضی سے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا یا زبردستی اور اگر یہ سوال بھی حل ہو جائے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا یسوع پھر صلیب پر مرا بھی کہ نہیں۔ کیونکہ اگر وہ پھانسی پر نہیں مرا تو سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا اور جب اتنے

سوال حل ہو جائیں تو پھر کفارہ کے مسئلہ پر انسان گفتگو کر سکتا ہے اور تب صحیح موقعہ ہے کہ اس خلاف عقل مسئلہ پر توجہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ آیا یہ واقعہ ہؤا ہے یا ہو سکتا ہے۔

پس میں مختصراً انہی سوالوں پر روشنی ڈالتا ہوں اور اول اس بات کو دیکھتا ہوں کہ آیا ایک سے زیادہ خدا ہو سکتے ہیں اور چونکہ مخاطب میرے اس وقت مسیحی صاحبان ہیں اس لئے سب سے پہلے بائبل کا حوالہ دیتا ہوں کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کے نبیوں کی شریعت کی سچائی کے خود یسوع بھی مقر ہیں۔ استثناء ۳۲ آیت ۳۹ میں لکھا ہے "اب دیکھو کہ ہاں میں ہی وہ ہوں اور کوئی معبود میرے ساتھ نہیں میں ہی مارتا ہوں اور میں ہی جلاتا ہوں میں ہی زخمی کرتا ہوں اور میں ہی چنگا کرتا ہوں اور ایسا کوئی نہیں جو میرے ہاتھ سے چھڑادے" اور پھر استثناء ۴ آیت ۳۵ میں ہے "یہ سب تجھ ہی کو دکھایا گیا کہ تو جانے کہ خداوند ہی خدا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی نہیں" پھر یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۵ میں ہے "میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں" پھر یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۱۸، ۲۱، ۲۲ میں ہے "کیا میں خداوند نے ہی یہ نہیں کہا کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ صادق القول اور نجات دینے والا خدا میرے سوا کوئی نہیں میری طرف رجوع لاؤ تاکہ تم نجات پاؤ۔ اے زمین کے کناروں کے سارے رہنے والو کہ میں خدا ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں"۔ یہ آیات تو وہ ہیں کہ جو پرانے عہد نامہ سے نقل کی گئی ہیں۔ اور جن سے تثلیث کا مردود ہونا بیّن و ظاہر ہے اب نئے عہد نامہ یعنی انجیل سے میں ایک آیت نقل کرتا ہوں کہ جس سے منکشف ہو جائے گا کہ خود مسیح بھی تثلیث کا منکر اور توحید کا قائل تھا۔ چنانچہ مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹، ۳۰ میں مرقوم ہے کہ کسی نے مسیح سے پوچھا کہ سب حکموں میں سے اول کون سا ہے تو "یسوع نے اس کے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں سے اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے اور اپنے سارے زور سے پیار کر اول حکم یہ ہے"۔ پس باوجود اس حکم کے جو خود مسیح دیتا ہے کہ سب سے پہلے تیرا فرض یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی توحید کا قائل ہو یہ کہنا کہ خدا تین ہیں کس قدر بعید از عقل ہے۔

یہ ثبوت تو وہ ہے جو خود مسیحیوں کی کتب مقدسہ میں سے میرے دعویٰ کی تائید میں ملتا ہے اور علاوہ اس کے خود مسیح بھی توحید کی ہی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن قطع نظر اس ثبوت کے عقل بھی تثلیث کی مؤیّد نہیں کیونکہ جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں اس عالم مادی کو دیکھ کر بے شک انسان کو خیال آتا

ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی ہونا چاہئے۔ لیکن عقل قطعاً اس بات پر گواہی نہیں دیتی کہ ایک سے زیادہ خالقوں نے اس عالم کو بنایا ہے۔ کیونکہ یا تو اس دنیا کو ایک ہی ہستی نے بنایا ہے یا بہت سی ہستیوں نے بنایا ہے۔ اور ہر ایک اس کے ایک حصہ کے بنانے پر قادر تھی اور دوسرے پر نہیں۔ یا یہ کہ ہر ایک ہستی اس دنیا کو پیدا کر سکتی تھی لیکن اس نے اسے بنایا نہیں بلکہ سب نے مل کر بنایا ہے۔ سو پہلی صورت کو تو عقل تصور میں لا سکتی ہے اور دوسری دو صورتوں کو نہیں کیونکہ دوسری صورت میں تو خدا تعالیٰ ناقص ٹھہرتا ہے۔ اور تیسری صورت کو عقل دریافت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں کہ جس کے ذریعہ سے معلوم کر سکیں کہ یہ دنیا ایک نے بنائی ہے یا دو نے یا تین نے یا چار نے۔ پس بہرحال یہی صورت اختیار کرنی پڑے گی کہ یہ سب عالم ایک طاقتور خدا نے بنایا ہے۔ اور اسی کی مؤیّد ہیں وہ آیتیں جو کہ میں نے خود مسیحیوں کی کتب مقدسہ سے نقل کی ہیں۔ پس جب خدا تعالیٰ کی توحید ثابت ہو گئی تو کفارہ کے لئے ایک خدا کے مصلوب کر دینے کی گنجائش بھی باقی نہ رہی۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایک سے زیادہ ہستیاں قبول بھی کر لی جائیں تو پھر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ دو ہیں یا تین ہیں یا چار ہیں کیونکہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہیں تو پھر یہ بات برابر ہے کہ وہ دو ہوں یا ہزاروں ہوں پس اس کا ثابت کرنا بھی مسیحیوں کے لئے دقّت طلب ہو گا۔ اور جبکہ مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق مصلوب ہونے والا بیٹا چاہئے تو یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو گا کہ آیا وہ خدا آپس میں ولدیت کا تعلق رکھتے ہیں یا بھائی بھائی ہیں کیونکہ جب تک ان میں سے ایک بیٹا نہ ثابت ہو لے تو مسیح کا مصلوب ہونا بے فائدہ رہتا ہے۔

پھر یہ مان کر کہ تین خدا ہیں۔ اور ان میں سے دو کا تعلق آپس میں باپ بیٹے کا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں مسیح کو ہی بیٹا تصور کیا جائے کیا وجہ ہے کہ جب اس سے بہتر آدمی دنیا میں موجود ہیں تو انہیں ابن اللہ کا کام دیا جائے کیونکہ خدا مخلوق سے بہرحال زیادہ طاقتور ہونا چاہئے۔ پس مسیح کسی طرح خدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے زیادہ لائق اور زیادہ کامیاب آدمی دنیا میں موجود ہیں پس اگر ضرور کسی کو دنیا میں ابن اللہ بنانا ہے تو کیوں نہ ان کو اسی خطاب سے پکارا جائے۔ کیونکہ وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اور جب اس مقابلہ پر کوئی دوسرا شخص مسیح کو نیچا دکھائے تو پھر مسیح کی ابنیّت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ بھی خود بخود رد ہو جائے گا۔ اور چونکہ اس موقعہ پر مسیحیت اور اسلام کا مقابلہ کرتا ہوں اس لئے رسول اللہ ؐ اور مسیحؑ کی زندگیوں کا نہایت مختصر الفاظ میں مقابلہ کر کے

دکھلاتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کس کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ مسیحؑ کی پیدائش جس ملک میں ہوئی ہے وہ اپنے وقت میں امن و امان کے لئے مشہور تھا۔ لیکن اس کے برخلاف رسول اللہ ؐ جس ملک میں پیدا ہوئے ہیں وہ اپنے فسادوں اور جنگوں کے لئے شہرۂ آفاق تھا۔ اور ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھ کر ایک عقلمند انسان خوب سمجھ سکتا ہے کہ آپؐ کو اس ملک کے درست کرنے کے لئے کیا کیا مشکلات پیش آسکتی تھیں اور برخلاف اس کے مسیحؑ کس امن و چین میں تھا۔ کیونکہ یروشلم پر اس وقت رومیوں کی حکومت تھی جو کہ اپنے وقت میں قانون کی پابندی کے لئے ایک خاص شہرت رکھتے تھے اور ان کے ملک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی شخص پر بلا قانون کے ظلم کر سکے۔ پس مسیحؑ کا اس ملک میں پیدا ہونا اس کے لئے بہت سی آسانیوں کا باعث تھا کیونکہ گو اس کے مخالف اس کی تعلیمات کے اور اس کی جان کے ہی مخالف ہوں لیکن جوش کے ماتحت اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور گو وہ غضب میں اندھے بھی ہو جاتے مگر ان کے لئے بغیر قانون کی آڑ کے اور کوئی وسیلہ نہ تھا جس سے مسیحؑ کو سیدھا کر سکیں۔ برخلاف اس کے رسول اللہ ﷺ کو جس قوم سے واسطہ پڑا تھا وہ اپنے جوشوں کے پورا کرنے کے لئے بالکل آزاد اور مختار تھی اور کوئی قانون نہ تھا جو ایسے سخت سے سخت ارادوں کی روک تھام کر سکے اور نہ صرف کوئی دنیاوی سلطنت یا قانون ہی اس کو اپنی حدود میں نہ رکھ سکتا تھا بلکہ کوئی شریعت بھی اس قوم کے پاس نہ تھی جو کہ اس کے دل پر حکومت کرتی ہو اور نہ ہی علوم سے ان کو کچھ بہرہ تھا کہ اخلاق کی رہنمائی سے ہی وہ اپنے جوشوں سے باز رہتی۔ پس اگر مسیحؑ کی قوم قیدی تھی تو یہ اس کے برخلاف آزاد تھی اور اگر وہ بند تھی تو یہ کھلی تھی۔ اور اگر اس کے رستہ میں رکاوٹیں تھیں تو یہ بے روک ٹوک تھی اور اگر وہ اپنے جوشوں کے پورا کرنے سے قاصر تھی تو یہ قادر تھی اور وہ کسی شریعت کے جوئے یا عذاب کے خوف کے نیچے تھی تو یہ ان دونوں باتوں سے بری۔ پس جو اختیار کہ مسیحؑ پر اس کی قوم کو تھا۔ اس سے کہیں زیادہ رسول اللہ ﷺ پر آپؐ کی قوم کو تھا اور جو نقصان کہ مسیحؑ کی قوم اس کو بسبب گوناگوں رکاوٹوں کے نہ پہنچا سکتی تھی وہ رسول اللہ ؐ کی قوم اپنی آزادی کی وجہ سے پہنچا سکتی تھی۔ پھر مسیحؑ قانون کی پناہ میں ہونے کے علاوہ اپنے ماں باپ کی پناہ اور اپنے بھائیوں کی حمایت میں تھا برخلاف اس کے رسول اللہ ؐ کے والدین اور دادا آپؐ کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اور صرف ایک چچا کی مدد آپؐ کے ساتھ تھی۔ پھر مسیحؑ کی تعلیم وہی تھی جو کہ توریت و زبور وغیرہ کی ہے لیکن رسول اللہ ؐ کفار کے اپنے طرز عمل کو ہی برا نہ کہتے تھے بلکہ ان کے معبودوں کو بھی حَصَبُ جَهَنَّمَ قرار دیتے تھے۔ جس

سے پتہ لگ سکتا ہے کہ مسیحؑ کی قوم کو ان سے کچھ زیادہ اختلاف نہ تھا مگر رسول اللہؐ کی قوم میں اور آپؐ میں ایک اختلافات کا سمندر حائل تھا جو ان کو آپؐ کی مخالفت کے لئے ہر دم ابھارتا تھا۔ پھر جو شخص مسیحؑ کی پیروی کرتا تھا اسے سوائے گالیوں کے اور کچھ نقصان نہ پہنچتا تھا یا زیادہ ہؤا تو کہیں مار پیٹ پڑ جاتی تھی۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا نہ صرف عزیز و اقرباء سے قطع تعلق کر لینا تھا بلکہ اپنی جان سے بھی ناامید ہونا تھا۔ چنانچہ حواریوں کا زیادہ سے زیادہ پٹنا ثابت ہے اور صحابہؓ کا نہ صرف مار کھانا بلکہ قتل ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے اور پھر قتل بھی معمولی نہیں۔ ایسے واقعات بھی ہیں کہ مرد کی ایک ٹانگ ایک اونٹ سے باندھ دی اور دوسری دوسرے سے اور پھر دونوں کو مختلف سمتوں میں چلا دیا اور پھر مسیحؑ کے ساتھ کی عورتوں کی نسبت تو گالی گلوچ بھی ثابت نہیں اور رسول اللہؐ کو ماننے والی عورتوں میں سے بعض کا قتل اور ایسا قتل کہ ان کے فروج میں نیزہ مار کر مار دیا گیا ثابت ہے۔ پھر مسیحؑ شہروں اور بستیوں میں کھلم کھلا وعظ دیتا پھرتا تھا اور رسول کریم ﷺ کے مخالفین آپؐ کو اس قدر آزادی نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ کا اکے دکے آدمیوں میں تبلیغ کرنا بھی وہ لوگ ناپسند کرتے تھے۔ اور جہاں آپؐ کو دیکھتے زدوکوب کرنے سے نہ ٹلتے تھے پھر اگر مسیحؑ کہیں بھاگ جاتا تو وہ لوگ ایسے ناراض نہ تھے کہ اس کا پیچھا کرتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو آپؐ کا پیچھا لوگوں نے وہاں تک کیا۔ مسیحؑ کے پکڑنے کا خیال اس کے مخالفین کو ایسا نہ تھا۔ جتنا کہ آپؐ کے مخالفین کو آپؐ کے گرفتار اور قتل کرنے کا تھا۔ کیونکہ مسیحؑ کے سر کا اس کے دشمنوں نے تیس درہم انعام مقرر کیا لیکن رسول اللہؐ کے لئے ایک سو اونٹ کا انعام اعلان کیا گیا۔ پھر مسیحؑ کی جنگ یعنی زبانی بات چیت صرف یہودیوں سے تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سچائی سے سب دنیا کو اپنے مقابل پر لا کھڑا کیا تھا۔ اور مسیحؑ اپنی حکومت کی پناہ میں تھا اور رسول اللہ ﷺ کے مقابل پر نہ صرف آپؐ کی اپنی قوم تھی بلکہ اس وقت کی دونوں زبردست یعنی قیصر روما اور کسریٰ کے ایران کی حکومتیں بھی آپؐ کے استیصال کا ارادہ رکھتی تھیں اور علاوہ ان کے عرب کے مسیحی اور یہودی بھی آپؐ کے ساتھ بیر رکھتے تھے۔ مگر باوجود ان تمام مشکلات کے جو رسول اللہ ﷺ کے راستہ میں تھیں اور ان خطرات کے جو آپؐ کی ہلاکت کے لئے اگر آپؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہوتے کافی تھے۔ آپؐ بڑھے اور پھولے اور پھلے اور دن رات آپؐ کا قدم آگے بڑھا اور جو کوئی آپؐ کے مقابلہ میں آیا ہلاک ہوا۔ اور جو کوئی آپؐ پر گرا ہلاک ہؤا اور جس پر آپؐ گرے اسے ہلاک کر دیا۔ آپؐ

کے مخالفین کے گھر اجڑ گئے ان کی بستیاں ویران ہو گئیں جس نے آپؐ پر تلوار چلائی قتل کیا گیا ان کی بیویاں بیوہ ہو گئیں ان کے بچے یتیم ہوئے۔ ان پر رونے والا بھی کوئی نہ ملا۔ چیلیں اور کتے آپؐ کے اعداء کا گوشت کھا گئے۔ وہ دنیا و آخرت میں ذلیل کئے گئے اور کوئی نہ تھا جو ان کو بچاتا وہ برباد کر دیئے گئے اور کوئی نہ نکلا جو ان کی مدد کو آتا۔ جنہوں نے آپؐ کو گمنام کرنا چاہا تھا وہ خود گمنام ہو گئے اور آج تک ان کے نام و نشان کا پتہ نہیں آج کوئی ہے جو ابو جہل کی نسل ہونا اپنے لئے پسند کرے۔ کیا کوئی ہے جو عتبہ و شیبہ کے نام اپنے آباء میں لینا فخر سمجھے۔ وہ صنادید عرب جو اپنے ملک کے باپ کہلاتے تھے۔ ان کی امارتیں آپؐ کے سامنے گر گئیں وہ آپؐ کی اطاعت میں سر کے بل گرائے گئے۔ ان کے ماتھوں پر غلامی کا داغ لگایا گیا وہ بہادروں کا بہادر اور بادشاہوں کا بادشاہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ فتح کرنے گیا اور وہ بت جو خدائے واحد کے مقابلہ میں کھڑے کئے جاتے تھے اسی کے بندہ کے آگے سرنگوں کئے گئے۔ اور اس کے زبردست ہاتھوں ان کے ٹکڑے اڑا دیئے گئے۔ زمین سے لے کر آسمان تک اس کا نور چمکا اور خود خدا نے اس کے صدق پر شہادت دی اور اس کا رحیم کریم دل اپنے مخالفین کے لئے پسیجا اور لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کی دلکش آواز نے نہ صرف آپؐ کے مخالفین کے جسموں کو ہی بچالیا بلکہ ان کی روحوں کو بھی ابدی دوزخ کے پھندے سے نجات دلادی۔ (الکامل فی التاریخ۔ ابن الاثیر جلد ۱ صفحہ ۲۴۳۔ بیروت ۱۹۶۵ء)

لیکن یسوع باوجود ان آسانیوں کے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ نہ اس کی قوم ایسی خطرناک تھی اور نہ اس کو اس سے ایسی دشمنی ہی تھی روز بروز کمزور ہی ہوتا گیا۔ اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ شخص اپنے حواریوں کو بارہ تختوں کا وعدہ دیتا تھا اور ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو شہزادہ کہتا تھا جو یہودیوں کی ہلاکت کی پیشگوئیاں کر رہا تھا جو رومن سلطنت کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھتا تھا جسے اپنی ترقیوں کی بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ اور جو آسمانی بادشاہت کے وعدہ دے کر اپنے حواریوں کے حوصلہ کو بڑھا رہا تھا۔ یہودیوں کے قبضہ میں پڑا اور کچھ ایسا پھنسا کہ آخر نہایت کرب و اندوہ اٹھا کر سولی پر لٹکایا گیا۔ اور اس وقت اس کے دشمنوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور کانٹوں کا تاج پہنایا اور پانی کی جگہ سرکہ پلایا۔ اور اس بے بسی و بے کسی کی حالت میں وہ چیخا اور ایلی ایلی لما سبقتنی کی دردناک اور مایوسی کی مجسم آواز اس کے منہ سے نکلی اور بقول مسیحیوں کے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ان تمام دعووں پر جو اس نے اپنی ذات کی نسبت اور حواریوں کے بارے میں کئے تھے پانی پھر گیا۔ اب بتاؤ کہ کیا وہ شخص جو باوجود سخت سے

سخت مصیبتوں کے اور دشمنوں کے حملہ کے کامیاب ہؤا۔ خدا کا بیٹا کہلانے کا مستحق ہے یا وہ جو مقابلۃً چین اور آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا اور جس کے راستہ میں کوئی سخت رکاوٹیں نہیں تھیں۔ مگر باوجود اس کے ناکامی و نامرادی سے اس دنیا سے گزر گیا۔ (بقول مسیحی صاحبان کے)

یہ تو دنیاوی کامیابی ہوئی علاوہ اس کے کامل تعلیم سچے اور مخلص مرید اور پاک زندگی اور بے نظیر معجزات اور قدسی صفات کے لحاظ سے بھی رسول اللہ ؐ کو مسیحؑ پر بدرجہا فضیلت تھی۔ پس کوئی رنگ بھی لے لو اور کسی طریق پر بھی آپ ؐ کا مسیحؑ سے مقابلہ کر لو۔ آپ ؐ کی فضیلت مسیحؑ پر ثابت ہے۔ پس اگر کسی معنے میں کوئی خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے۔ تو وہ رسول اللہ ؐ ہیں نہ کہ مسیحؑ۔ علاوہ ازیں مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا بھی نہیں بلکہ وہ تو ہمیشہ ابن آدم ہی کہلاتا رہا۔ ہاں اگر سمجھیں۔ خدا کے بیٹے کا لفظ اس نے اپنے لئے استعمال کیا بھی تو ان معنوں میں تو بہت سے آدمی خدا کے بیٹے ہیں۔ مثلاً کل یہودیوں کی نسبت توریت میں ہے کہ "تب تو فرعون کو یوں کہیو کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے" (خروج ۴ آیت ۲۲) سو اس آیت سے تو کل بنی اسرائیل ہی خدا کے بیٹے بلکہ پلوٹھے معلوم ہوتے ہیں مسیحؑ کی خصوصیت ہی کیا ہے۔

یسوع صلیب پر خوشی سے نہیں چڑھا

اس کے بعد جو بات کفارہ کے مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے کہ آیا مسیحؑ صلیب پر لٹکایا جانے کے لئے خوش بھی تھا یا نہیں۔ اگر وہ ناراض تھا تو پھر کفارہ کا مسئلہ کسی طرح بھی صادق نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لئے ہم کو دور جانے کی ضرورت نہیں خود مسیحؑ کی اس وقت کی حالت کا بیان کافی ہوگا۔ چنانچہ متی ۲۶ آیت ۳۶ تا ۴۰ میں لکھا ہے کہ "پھر یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک مقام پر آیا۔ اور شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھو جب تک میں وہاں جا کر دعا مانگوں تب اس نے پطرس اور زبدی کے دو بیٹے ساتھ لئے اور غمگین اور نہایت دلگیر ہونے لگا۔ تب اس نے ان سے کہا کہ میرا دل نہایت غمگین ہے بلکہ میری موت کی سی حالت ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو اور کچھ آگے بڑھ کر منہ کے بل گرا۔ اور دعا مانگتے ہوئے کہا کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گزر جائے تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری خواہش کے مطابق ہو"۔ پھر لوقا ۲۲ آیت ۳۹ تا ۴۶ میں ہے کہ "اور وہ نکل کے اپنے دستور پر زیتون کے پہاڑ کی طرف چلا۔ اور اس کے شاگرد اس کے پیچھے ہو لئے اور اس جگہ پہنچے اس نے ان سے کہا دعا مانگو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو اور اس نے ان سے تیر کے ایک ٹپے پر بڑھ کے گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی۔ اور کہا کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ

سے دور کر لے لیکن میری مرضی نہیں۔ بلکہ تیری مرضی کے موافق ہو اور آسمان سے ایک فرشتہ اس کو دکھائی دیا۔ جو اسے قوت دیتا تھا۔ اور وہ جانکنی میں پھنس کے بہت گڑگڑا کے دعا مانگتا تھا اور اسکا پسینہ لہو کی بوند کی مانند ہو کر زمین پر گرتا تھا۔ اور دعا سے اٹھ کر اپنے شاگردوں کے پاس آیا اور انہیں غم سے سوتے پایا۔ اور ان سے کہا کہ تم کیوں سوتے ہو؟ اٹھ کر دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو"۔ اب ان دونوں حوالوں سے مندرجہ ذیل واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

اول تو یہ کہ اس واقعہ کی اطلاع ملنے سے یسوع پر ایسا غم طاری تھا کہ اس کی حالت موت کی طرح ہو گئی تھی۔ دوم یہ کہ اس نے اپنے شاگردوں سے بڑے زور سے التجا کی کہ وہ اس کے لئے دعا کریں تاکہ وہ اس مصیبت سے بچ جائے۔ سوم یہ کہ وہ خود بھی بہت گریہ وزاری سے اس تلخ پیالہ کے ٹل جانے کی دعا کرتا رہا چہارم یہ کہ اس کی اپنی مرضی صلیب پر لٹکنے کی نہ تھی بلکہ مجبور تھا۔ اور خدا تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ پنجم یہ کہ اس کا درد یہاں تک بڑھ گیا کہ خدا تعالیٰ کو تسلی دینے کے لئے ایک فرشتہ نازل کرنا پڑا۔ ششم یہ کہ پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی بلکہ اس نے دعا میں اس قدر زور لگایا کہ اس کا پسینہ خون کی طرح سرخ ہو کر بہنے لگا۔

ان سب باتوں کو غور سے دیکھو تو خود بخود کھل جائے گا کہ یسوع کا قطعاً منشاء نہ تھا کہ وہ صلیب پر لٹکایا جائے بلکہ اس خبر کو سن کر اس کے ہوش اڑ گئے اور صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور ہلاکت کا خوفناک منظر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اور زمین پاؤں کے تلے سے نکل گئی اور دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور اس نے اس خیال سے کہ شاید اس کی نہیں تو اس کے مریدوں کی دعا ہی بارگاہ الٰہی میں سنی جائے ان سے التجا کی اور عاجزی سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ کہ شاید وہ ابتلاء ٹل جائے۔ اور وہ مصیبت گزر جائے اور خود بھی اس حد تک دعا کی کہ شدت غم میں پسینہ کی جگہ خون بہنے لگا۔ تو جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ گھٹنوں کے بل گر گر کر اپنے بچائے جانے کی درخواست کرے اور گڑگڑائے اور روئے اور چلائے اور آسمان کو سر پر اٹھا لے اس کی نسبت کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کے گناہ اپنے سر پر اٹھا لئے اور خوشی سے صلیب پر چڑھ گیا۔ اگر یہی آثار خوشی کے ہوتے ہیں۔ تو جیل خانوں میں سینکڑوں آدمی ہر سال اسی خوشی سے جانیں دیتے ہیں۔

لوقا کا یہ لکھنا کہ اس کی تسلی کے لئے فرشتہ بھیجا گیا ظاہر کرتا ہے کہ یسوع کا غم کمال تک پہنچ گیا تھا۔ ورنہ خدا تعالیٰ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ فرشتہ بھیجتا۔ کہ جو اس کے دل کو آکر سہارا دیتا۔ مگر

عجیب بات یہ ہے کہ باوجود فرشتہ کے تسلی دینے کے یسوع کا دل مطمئن نہ ہؤا اور وہ برابر گھبراتا رہا۔ پس اگر واقعی وہ اپنی مرضی سے صلیب پر چڑھنے کے لئے اس دنیا میں آیا تھا تو یہ رنج اور یہ گھبراہٹ اور یہ گریہ وزاری کیونکر ہو سکتی تھی؟

پھر یسوع اپنی دعا میں یہ کہتا ہے کہ اے باپ جس طرح ہو یہ پیالہ مجھ سے ٹال دے۔ مگر وہی ہو جو تیری مرضی ہو نہ کہ میری۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یسوع کی مرضی تو یہی تھی کہ وہ صلیب پر نہ لٹکایا جائے۔ مگر حکم خداوندی کے آگے کچھ پیش نہ چلتی تھی۔ تب ہی تو کہتا ہے کہ باوجود میری اس خواہش کے کہ میں صلیب سے بچ جاؤں میں تیری مرضی پر صابر ہوں۔ پس اس سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ یسوع خود صلیب پر نہ چڑھنا چاہتا تھا۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا باپ نے (نعوذ باللہ) اس کو زبردستی صلیب پر لٹکایا۔ اور اس کا ایسا کرنا صریحاً عدل کے خلاف تھا کیونکہ کسی معصوم اور بے گناہ کو زبردستی صلیب پر لٹکانا سخت ظلم ہے پس جس طریقہ سے مسیحی خدا کا عدل ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی سے اس کا ظلم ثابت ہوتا ہے اور خدا کی طرف ظلم کا منسوب کرنا خود ایک بڑا ظلم ہے۔

مگر سب سے بڑھ کر یسوع کے وہ کلمات ہیں جو کہ اس نے صلیب پر لٹکایا جانے کے وقت بار بار دہرائے اور وہ یہ ہیں کہ ایلی ایلی لما سبقتنی۔ یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ یہ کلمات ایسے توحید سے پر اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ عقلمند انسان ان کو سن کر کبھی گمان نہیں کر سکتا کہ یسوع بھی خدائی کا شریک ہو سکتا تھا۔ اور پھر اگر وہ خوشی سے صلیب پر لٹکنا چاہتا تھا۔ تو وہ اس حد تک کیوں گھبرا جاتا۔ کہ خدا پر اپنے عہد کے ترک کر دینے کا الزام دیتا۔ اگر وہ مسیحی دنیا کے بچانے کے لئے ہی دنیا میں آیا تھا۔ تو جس دن اس نے سنا تھا کہ مجھے صلیب پر لٹکانے لگے ہیں۔ اس دن اسے بجائے غم کے خوشی ہونی چاہئے تھی۔ اور چاہئے تھا کہ وہ اپنے کل مریدوں کو اکٹھا کر کے جشن کرتا۔ اور اپنی عادت کے مطابق وہ سب لوگ مل کر خوب شرابیں پیتے۔ اور ناچتے اور گاتے کہ وہ مبارک دن اور بابرکت گھڑی اب قریب آگئی ہے کہ جس کے شوق میں یسوع آسمان کو چھوڑ کر اس زمین پر آیا تھا۔ اور مصلوب ہوتے وقت بجائے یہ کہنے کے کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اسے یہ کہنا چاہئے تھا۔ کہ اے میرے باپ۔ اے میرے باپ میں خوشی سے بنی نوع انسان کے لئے جان دیتا ہوں اور ان کے گناہ اپنے سر پر اٹھاتا ہوں۔ مگر وہ گھبراہٹ وہ آہ و زاری ظاہر کرتی ہے کہ جس کفارہ کو مسیحی صاحبان نجات کا ایک ہی

ذریعہ قرار دیتے ہیں خود یسوع بھی اس سے ناواقف تھا۔

یسوع صلیب پر نہیں مرا

ان سب باتوں کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ آیا یسوع صلیب پر فوت بھی ہؤا تھا کہ نہیں اور چونکہ مسیحیوں کو قائل کرنے کے لئے سب سے بہتر ذریعہ اناجیل ہی ہیں اس لئے میں انہیں سے ہی روشنی ڈالتا ہوں۔ یسوع کی صلیبی موت قطعاً ثابت نہیں بلکہ صلیب پر سے بچ جانا ثابت ہے۔ متی باب ۲۷ میں ہے کہ جب یسوع حاکم کے سامنے لے جایا گیا تو اس نے اس سے بہت سے سوال کئے مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اس پر حاکم بہت متعجب ہؤا۔ مگر اس کا دستور تھا کہ ہر عید پر ایک قیدی کو یہودیوں کی خاطر چھوڑ دیتا تھا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا۔ میں کس کو چھوڑوں۔ برناباس کو جو ایک مشہور چور تھا یا یسوع کو۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یسوع حسد کی وجہ سے پکڑایا گیا تھا۔ یہودیوں نے برابا کو چھوڑنے کی درخواست کی۔ اتنے میں حاکم کی بیوی نے آدمی بھیجا۔ کہ خبردار اس نیک آدمی کو کچھ نہ کہنا کیونکہ میں نے آج رات کو اس کی وجہ سے بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ اس لئے پیلاطوس نے پھر یسوع کو بچانے کے لئے کوشش کی۔ مگر یہودیوں نے نہ مانا تو اس نے ان سے پوچھا۔ کہ کیوں اس نے کیا بدی کی کہ میں اسے صلیب پر لٹکاؤں انہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور یہی شور مچایا کہ نہیں اسے صلیب دو۔ تب اس نے سب یہودیوں کے سامنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ تم جو چاہو کرو۔ میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں اور اسے یہودیوں کے سپرد کر دیا۔ جنہوں نے اسے جمعہ کے دن شام کے وقت صلیب پر لٹکا دیا اور ابھی تین گھنٹہ نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک بڑا زلزلہ آیا اور اندھیرا چھا گیا اور چونکہ یہودی سبت کے دن کسی کو صلیب پر نہ رکھ سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب کو اتار لیا اور یوحنا کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں۔ مگر یسوع کی کوئی ہڈی نہ توڑی۔ اور ایک شخص نے جب ان کے پہلو کو چھیدا تو اس میں سے خون نکلا پھر جیسا کہ متی لکھتا ہے۔ یوسف آرمیتیا یسوع کا ایک شاگرد پیلاطوس کے پاس گیا۔ اور اس سے اس کی لاش مانگی۔ مگر پیلاطوس نے بموجب بیان مرقس کے متعجب ہو کر شبہ کیا۔ کہ کیا وہ ایسی جلدی مر گیا۔ اور اسے اس کے سپرد کر دیا اس نے اسے ایک مکان میں جا کر ڈال دیا۔ اور مریم مگدلینی وغیرہ دروازہ پر بیٹھی رہیں پھر یہودیوں کو شبہ ہؤا کہ ایسا نہ ہو کہ یسوع کے شاگرد اسے چرا کر لے جائیں۔ اور کہہ دیں کہ وہ زندہ ہو گیا اس لئے اپنے پہرہ دار مقرر کئے۔ مگر جب وہ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پتھر قبر پر سے ڈھلکا ہؤا ہے۔ اور ایک آدمی نے مریم مگدلینی وغیرہ سے جو وہاں یسوع کے دیکھنے

کو آتی تھیں کہا کہ یسوع تو اب یہاں نہیں ہے بلکہ چلا گیا ہے تم جا کر اس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ گلیل میں تم کو ملے گا- غرض وہ وہاں گئیں اور گلیل میں سب شاگرد اکٹھے ہوئے اور یسوع بھی چھپتا ہوا وہاں پہنچا- مگر اس کے شاگردوں نے شک کیا- کہ شاید یہ اس کی روح ہے مگر بقول یوحنا کے اس نے تھوما سے کہا کہ وہ اس کے زخموں میں انگلیاں ڈال کر دیکھے کیونکہ روح میں ہڈی نہیں ہوتی- اور پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر مچھلی اور روٹی اور شہد کھایا-

اب ان تمام واقعات کو ملا کر دیکھو کہ کیا ان سے یسوع کی وفات ثابت ہوتی ہے یا اس کا بچ جانا ثابت ہے- حاکم وقت اس کو بچانا چاہتا تھا- اور اس کی بیوی نے خواب دیکھا تھا کہ اگر اس کو تکلیف پہنچی تو تمہاری خیر نہیں- اس کو یقین تھا کہ یسوع بے گناہ ہے- پھر جب وہ صلیب پر لٹکایا گیا ہے- تو جمعہ کا دن تھا اور شام کا وقت اور باوجود اس کے اندھیری آگئی- اور یہودی ڈرے کہ کہیں شام نہ پڑ گئی ہو- کیونکہ ان کے مذہب کے رو سے ہفتہ کے روز کسی کا صلیب پر لٹکانا عذاب کا محرک تھا پس انہوں نے اسے بہ موجب مختلف روایات کے اڑھائی گھنٹہ سے پانچ گھنٹہ تک لٹکایا- حالانکہ صلیب پر آدمی تین دن تک لٹک کر بھی زندہ رہتے تھے اور ہڈیاں توڑے جانے پر مرتے تھے- پھر مسیح دو تین گھنٹوں میں کیونکر مرگیا- پھر اس کے دو ساتھیوں کی تو ہڈیاں توڑی گئیں- اس کی ہڈیاں بھی توڑی نہ گئیں اور اس کا پہلو چھیدنے پر خون نکلا جو زندگی کی علامت ہے پھر اس کے شاگرد یوسف نے جھٹ پٹ اس کی لاش حاصل کرنے کی کوشش کی اور خود حاکم وقت کو شبہ ہوا کہ اتنی جلدی یسوع کیونکر مرگیا- لاش حاصل کر کے کسی تنگ قبر میں نہیں بلکہ ایک کمرہ میں رکھی تا کہ ہوا گزر رہے پھر یسوع ہوش آنے پر چھپ کر نکلا اور جلیل گیا اور خفیہ خفیہ ہی شاگردوں سے ملا اگر وہ مر کر زندہ ہؤا تھا- اور اب پھر خدا ہو گیا تھا تو اسے چھپنے کی کیا ضرورت تھی- اور پھر خود یہودیوں کو شبہ تھا کہ وہ زندہ ہے تبھی انہوں نے پہرہ مقرر کیا- غرض یسوع پر مسیحیوں کی طرح حواریوں نے بھی شبہ کیا کہ شاید کوئی روح ہے- مگر اس نے انہیں اپنے زخم دکھائے- اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا- اب ان سب واقعات کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مر گیا تھا- بلکہ ثابت ہے کہ وہ زندہ تھا- اور علاوہ ان واقعات کے تاریخی شہادت بھی ہے کہ یہودیوں نے اس کی تلاش کی اور وہ ان سے چھپتا ہؤا کشمیر میں آیا- اور یہاں ایک سو بیس برس کی عمر پا کر فوت ہو گیا- اور خانیار محلہ میں اس کی قبر ہے اور میں نے خود دیکھی ہے چنانچہ میں نے اس کی نگہبان بڑھیا سے پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے تو اس نے کہا کہ عیسیٰؑ نبی کی جو کسی اور ملک سے آیا تھا- پھر میں نے جب اس سے سوال کیا- کہ مولوی تو کہتے ہیں کہ

وہ آسمان پر زندہ چلا گیا تو کیونکر کہتے ہیں کہ وہ مر گیا۔ تو اس نے کہا کہ وہ تو پڑھے ہوئے ہیں میں ان کے مقابلہ میں کیا کہہ سکتی ہوں مگر بڑوں سے یونہی روایت آئی ہے۔ پھر خود مسیحؑ کا کہنا کہ میں اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے لئے آیا ہوں ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کشمیر اور افغانستان میں آنا ضروری تھا۔ چنانچہ کشمیر میں اب تک بابل اور ہاروت ماروت کی قبریں موجود ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ بنی اسرائیل کا بقیہ ہے۔ اور خود لفظ کشمیر جو اصل میں کسیر ہے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل ہی سے ہیں کشمیریوں سے پوچھ کر دیکھو کہ وہ کون ہیں۔ تو وہ یہی جواب دیں گے کہ کاشر یعنی کشمیر کے رہنے والے۔ جس کے معنی ہیں ک شیر یعنی وہ ملک جو شام کی مانند ہے چنانچہ یروشلم کا علاقہ شیر یا سیر☆ کہلاتا تھا پس عقلاً بھی اور نقلاً بھی یسوع کا وہاں آنا ثابت ہے۔ اور اس کا صلیب سے بچ رہنا یقینی۔ پس جب ثابت ہو گیا کہ یسوع صلیب سے زندہ اتر آیا تھا۔ اور مرا نہ تھا تو کفارہ خود باطل ہو گیا۔

کفارہ پر دیگر اعتراضات

جس قدر ثبوت میں نے کفارہ کے ابطال کے دیئے ہیں ان سے کافی طور سے ثابت ہو گیا ہے کہ کفارہ کا مسئلہ من گھڑت ہے۔ اور بائبل سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اول تو خدائے تعالیٰ کی توحید ثابت ہے اور تثلیث بے ثبوت ہے۔ پھر یہ ثابت نہیں کہ ایک سے زیادہ خدا اگر مان لئے جائیں تو وہ باپ بیٹا ہیں اور پھر اگر باپ بیٹا بھی ہیں تو مسیح ہی وہ بیٹا ہے کیونکہ اگر بیٹا ہونا ضروری ہو تو اور آدمی موجود ہیں کہ جو ہر طرح ابنیّت کے یسوع سے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اگر یسوع کو بیٹا مان بھی لیا جائے تو یہ ثابت نہیں کہ اس نے خوشی سے صلیب پر لٹکایا جانا پسند بھی کیا تھا تو اس کا صلیب پر مرنا ثابت نہیں بلکہ صلیب سے صاف بچ کر کشمیر کی طرف چلا جانا ثابت ہے۔ لیکن اب میں کفارہ کے متعلق اور چند اعتراضات پیش کرتا ہوں کہ جن سے کفارہ کے خیال کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔

اول یہ کہ بائبل میں ہے کہ جو کاٹھ یعنی صلیب پر لٹکایا جائے گا وہ لعنتی موت مرے گا۔ اور خدا سے دور ہو گا پس کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص کی نسبت جو خدا کا بیٹا بھی مانا جائے یہ بات کہی جائے کہ ایک وقت اس پر ایسا آیا تھا کہ وہ خدا سے دور ہو گیا تھا کیونکہ خدا سے دور ہونا دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جب ایک شخص خدا تعالیٰ سے غافل ہو جائے اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ تو کہا

☆ سیریا کا لفظ سوری سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پھول اور سیریا کے معنی ہوئے وہ زمین جو خوبصورت پھولوں والی ہے اور کشمیر تو پھولوں کی منڈی ہے اس کا نام بنی اسرائیل نے اپنے وطن کی یاد میں کسیر رکھ کر اس شاعر کی تائید کی ہے۔ جو کہتا ہے۔ اگر فردوس بر روئے زمیں است۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔

جاتا ہے کہ وہ خدا سے دور ہے یا لعنتی ہے پس یسوع کی نسبت کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کسی وقت اسے خدا سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ اس سے دور ہو گیا تھا حالانکہ جھوٹے نبیوں کی نسبت پیشگوئی تھی کہ وہ تو کاٹھ پر لٹکائے جائیں گے مگر سچوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہ ہو گا۔ پس اگر یسوع کاٹھ پر مر گیا تھا تو کفارہ تو کفارہ خود یسوع کی نبوت تک ثابت نہیں ہوتی۔

دوم یہ کہ کفارہ کو مان کر بھی خدائے تعالیٰ کی عدالت ثابت نہیں رہتی۔ کیونکہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ اگر ایک کمزور مخلوق یعنی انسان گناہ کرے تو اسے ابدالآباد کے لئے جہنم میں ڈالا جاتا ہے اور اپنے بیٹے کو باوجود اس کے کہ اس کے سر پر کروڑوں گناہ ہیں تین دن کے لئے دوزخ میں رکھا جاتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ خدا تھا اور غیر محدود تھا اس لئے اسے تین دن کی سزا دی گئی تو اس پر یہ الزام آتا ہے کہ پھر خدا محدود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غیر محدود کے ساتھ محدود کو کوئی نسبت نہیں ہو سکتی اور جب دو چیزوں میں نسبت ہو گی۔ تو وہ ضرور محدود ہوں گی۔ کبھی کسی نے حساب میں یہ سوال نہ دیکھا ہو گا کہ اگر کسی محدود چیز کو اس قدر کام کے بدلہ میں اتنا بدلہ دیا جائے۔ تو غیر محدود ہستی کو اپنے ہی کام کے بدلہ میں کتنا دیا جائے گا۔ پس اس صورت میں یسوع کو تین دن کیا ایک سیکنڈ کی بھی سزا نہیں مل سکتی تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ گو نسبت تو کوئی نہیں بیٹھی مگر علی الحساب سزا دیدی گئی تھی تو یہ ظلم ہے پس یسوع کو تین دن تک سزا کا ملنا ممکن ہی نہیں اگر ممکن ہو بھی تو ظلم ہے۔

سوم یہ کہ یسوع کو جو تین دن تک دوزخ کی سزا ملی تو یہ خدا بیٹے کو سزا ملی تھی یا یسوع انسان کو اگر بیٹے کو سزا ملی تھی تو خدا میں تقسیم لازم آتی ہے۔ یعنی اگر تین خدا ہیں تو ان دنوں میں دو رہ گئے تھے اور اگر ایک ہیں تو اس کا ⅓ حصہ رہ گیا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ سزا یسوع انسان کو ملی تھی تو پھر وہی اعتراض پڑتا ہے کہ اس صورت میں اسے صرف تین دن کی سزا دینا مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق ظلم تھا۔ اور دوسرے ایک دھوکہ تھا کیونکہ جب واقعہ میں خدا بیٹا خدا باپ کے پاس موجود تھا۔ تو پھر اس نے ایک خاک کا پتلا بنا کر اس کا نام اپنا بیٹا رکھ دیا اور اسے صلیب دے کر اپنے عدل کو قائم رکھنے کی کوشش کی جو صریح دھوکہ ہے۔

چہارم کفارہ کا عقیدہ خلاف عقل ہے کیونکہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ زید کے پیٹ میں درد ہو اور عمر اپنی پسلی میں چھری مار لے۔ اور زید اچھا ہو جائے۔

پنجم اگر کفارہ سچا ہے تو پہلے نبیوں کا کیا حشر ہو گا کہ جو توحید کے قائل تھے اور انہیں یسوع کے کفارہ پر ایمان لانے کا موقعہ نہیں ملا اگر وہ کفارہ پر ایمان لائے بغیر نجات پا سکتے تھے تو ہم کیوں نہیں پا

سکتے اور کیا ئی ضرورت پیدا ہوئی تھی کہ یسوع کو صلیب پر لٹکانا پڑا- پہلے نبی بڑے زور سے توحید باری کے قائل تھے پس وہ کفارہ کے قائل کس طرح ہو سکتے تھے اور حضرت یوسفؑ سے جب ان کے بھائیوں نے کہا کہ بن یامین کے بدلہ میں ان کو قید کرے تو اس نے انکار کیا اور کہا کہ یہ ظلم ہے اگر کفارہ درست تھا تو انہوں نے کیوں نہ بدلہ منظور کر لیا-

ششم - اس وقت کی مسیحی سلطنتیں کیوں کفارہ پر عمل کر کے ایک کے بدلے میں دوسرے آدمی کو پھانسی نہیں دے دیتیں- کیونکہ اگر وہ اس کو جائز رکھیں تو ہزاروں آدمی روپیہ کے زور سے اپنے قائم مقام دے دیں اور خود کو سزا سے بچائیں-

ہفتم- کیا وجہ ہے کہ مسیحی گورنمنٹیں مسیحیوں کو سزا دیتی ہیں کیونکہ جب ان کے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو اب وہ جو چاہیں کریں ان پر کوئی الزام نہیں- اور اگر باوجود کفارہ پر ایمان لانے کے انسان کے لئے گناہوں سے بچنا لازمی ہے تو کفارہ کا فائدہ کیا ہؤا پھر تو کفارہ بالکل بے سود ہے اور دوسرے کفارہ کے مسئلہ کی ضرورت تو تب پڑی جبکہ مان لیا گیا کہ انسان گناہوں سے نہیں بچ سکتا- اس لئے اس کی نجات کے لئے یسوع صلیب پر لٹکایا گیا- پس اگر کفارہ کے ساتھ نیک اعمال کی شرط لگی ہوئی ہے تو نجات محال ہے کیونکہ مسیحی عقائد کے رو سے انسان گناہوں سے بچ ہی نہیں سکتا- پس جب انسان نے ضرور گناہ کرنے ہیں اور کفارہ نے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچانا جب تک اعمال نیک نہ ہوں تو نجات ناممکن ہوگئی اور اگر کہا جائے کہ کفارہ پر ایمان لانے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر مسیحی مجرم کو سزا دینا ناجائز ہؤا- بلکہ اگر وہ گندہ سے گندہ فعل بھی کرے تو اسے تسلی دینی چاہئے کہ تو نے بہت عمدہ کیا تیرے سب گناہ یسوع نے اٹھائے ہیں تو اب ناجی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جب انسان کفارہ پر ایمان لاتا ہے تو وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے تو یہ بالکل جھوٹ ہے کیونکہ مسیحی ممالک کے حالات اظہر من الشمس ہیں- اور یوروپین تہذیب کے واقف خوب جانتے ہیں- دوسرے بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسیحیوں نے کبھی گناہ نہیں کیا تو یہ اعتراض پڑتا ہے کہ جب مسیحی گناہ کرتے ہی نہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسیح نے ہمارے گناہ اٹھا لئے جب گناہ ہی نہ ہوئے تو پھر اٹھایا کیا-

غرض کوئی پہلو ہی لے لو کفارہ کا مسئلہ غلط ہی ثابت ہوتا ہے اور عقل سے بالا نہیں بلکہ اس کے خلاف ہے- پس جو طریق کہ مسیحی مذہب نے گناہوں سے نجات حاصل کرنے کا بتایا ہے- بالکل باطل اور بیہودہ ہے اور کوئی ذی عقل اس طریق سے اپنے گناہوں کی معافی کا امیدوار نہیں ہو سکتا- *

*(تشحیذ الاذہان مارچ تا مئی / جولائی تا ستمبر ۱۹۱۰ء)